THE NOBEL PRIZE
IN LITERATURE 2025

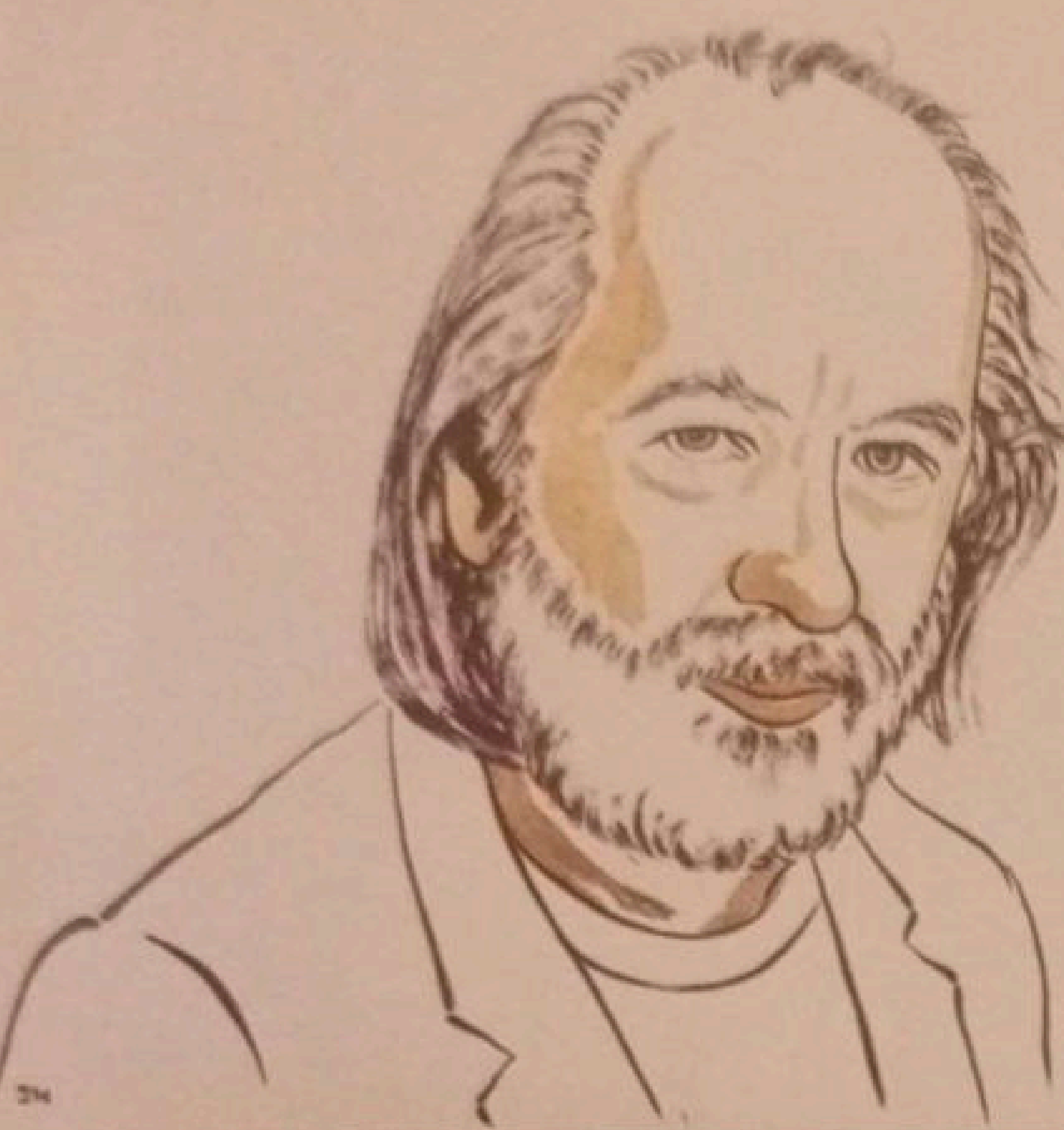

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

Monthly
Arzang
Lahore

ماہنامہ ارژنگ لاہور

نومبر ۲۰۲۵ء

مدیرِ اعلیٰ:
عامر بن علی

مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

دو ہزار پچیس کا نوبیل انعام برائے ادب ہنگری کے مصنف لاسلو کراسناہورکائی (László Krasznahorkai) کو دیا گیا ہے۔ انہیں یہ اعزاز ان کے ''دلکش اور بصیرت افروز ادبی کام کے لیے دیا گیا ہے جو خوف و ہراس کے عالم میں بھی فن کے طاقتور اثر کو ثابت کرتا ہے۔''

لاسلو کراسناہورکائی 1954 میں ہنگری کے جنوب مشرقی شہر گیولا (Gyula) میں پیدا ہوئے، جو رومانیہ کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ اسی طرح کا ایک دور افتادہ دیہی علاقہ ان کے پہلے ناول ''Sátántangó'' (شیطانی تانگو) کا پس منظر ہے، جو 1985 میں شائع ہوا اور ہنگری میں ایک بڑا ادبی واقعہ ثابت ہوا۔ یہ ناول کمیونزم کے خاتمے سے ذرا پہلے ایک ویران اجتماعی فارم پر رہنے والے چند مایوس باسیوں کی کہانی بیان کرتا ہے۔ خاموشی اور انتظار کی فضا چھائی رہتی ہے، جب تک کہ کرشماتی شخصیت اریمیاس اور اس کا ساتھی پیٹرینا، جنہیں سب مردہ سمجھ بیٹھے تھے، اچانک واپس نہیں آجاتے۔ رہائشیوں کے لیے ان کی آمد کسی معجزے یا فیصلے کا پیغام معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کے عنوان میں ''شیطانی'' عنصر دراصل ان کے جھوٹے نجات دہندہ والے رویے اور اریمیاس کے مکارانہ دھوکے میں چھپا ہے، جو جتنے مؤثر ہیں اتنے ہی تباہ کن۔ سب لوگ کسی معجزے کے منتظر ہیں، لیکن کتاب کا آغاز ہی کافکا کے اس جملے سے ہوتا ہے جو ان کی امیدوں کو توڑ دیتا ہے: ''اس صورت میں، میں انتظار کرتے کرتے موقع ہی کھو دوں گا۔'' اس ناول پر 1994 میں ہدایت کار بیلا ٹار کے ساتھ مل کر ایک منفرد فلم بھی بنائی گئی۔

امریکی نقاد سوزن سانٹاگ نے کراسناہورکائی کو ''عصرِ حاضر کے قیامت کے ادیب'' کا لقب دیا۔ اس رائے کی بنیاد ان کا دوسرا ناول ''Az ellenállás melankóliája'' (1989؛ اردو ترجمہ: مزاحمت کا المیہ) تھا، جو ایک چھوٹے ہنگری قصبے میں برپا ہونے والی خوفناک اور پراسرار کہانی بیان کرتا ہے۔ شروع سے ہی قاری مسز پفلام کے ساتھ ایک ہنگامی کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے۔ نحوست کے اشارے ہر طرف پھیلے ہیں۔ کہانی میں ایک پراسرار سرکس کا آنا اہم موڑ بن جاتا ہے، جس کا مرکزی تماشا ایک بڑے وہیل کی لاش ہے۔ اس مہمیز سے طاقتور اور تاریک قوتیں بیدار ہوتی ہیں، تشدد اور بدامنی پھیلتی ہے اور فوج کا کمزور ردعمل ایک آمرانہ قبضے کا موقع پیدا کر دیتا ہے۔ کراسناہورکائی خواب جیسی مناظر نگاری اور عجیب و غریب کرداروں کے ذریعے نظم و ضبط اور انتشار کے بیچ ہونے والی خوفناک کشمکش کو بے مثال انداز میں بیان کرتے ہیں۔ 1999 کے ناول ''Háború és háború'' (War&War) میں مصنف کا دھیان ہنگری کی سرحدوں سے نکل کر عالمی منظرنامے پر آ جاتا ہے۔ مرکزی کردار کورن، جو ایک معمولی آرکاوِسٹ ہے، اپنی زندگی کے آخری عمل کے طور پر بوداپیسٹ کے مضافات سے نیویارک کا سفر کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تاکہ وہ لمحہ بھر کے لیے دنیا کے مرکز میں اپنی جگہ بنا سکے۔ اس نے ایک قدیم رزمیہ داستان دریافت کی ہے جسے وہ دنیا تک پہنچانا چاہتا ہے۔

کراسناہورکائی کا نثر کا انداز وقت کے ساتھ تبدیل ہوتا گیا۔ انہوں نے طویل اور بہتی ہوئی نثر کو اپنی شناخت بنایا جن میں وقفے یا فل اسٹاپ نہیں ہوتے، بلکہ ایک مسلسل بیانیہ تخلیق کرتے ہیں جو ان کے کام کو منفرد بناتا ہے۔

(ڈاکٹر عقیل عباس جعفری)

تخلیق نامعلوم کو معلوم کرنے اور کروانے کی کسی صورت کا نام ہے

ذاتی تجربات و مشاہدات شعر کے بنیادی ماخذ ہیں

نئی نسل کے پسندیدہ شاعر

دانش نقوی

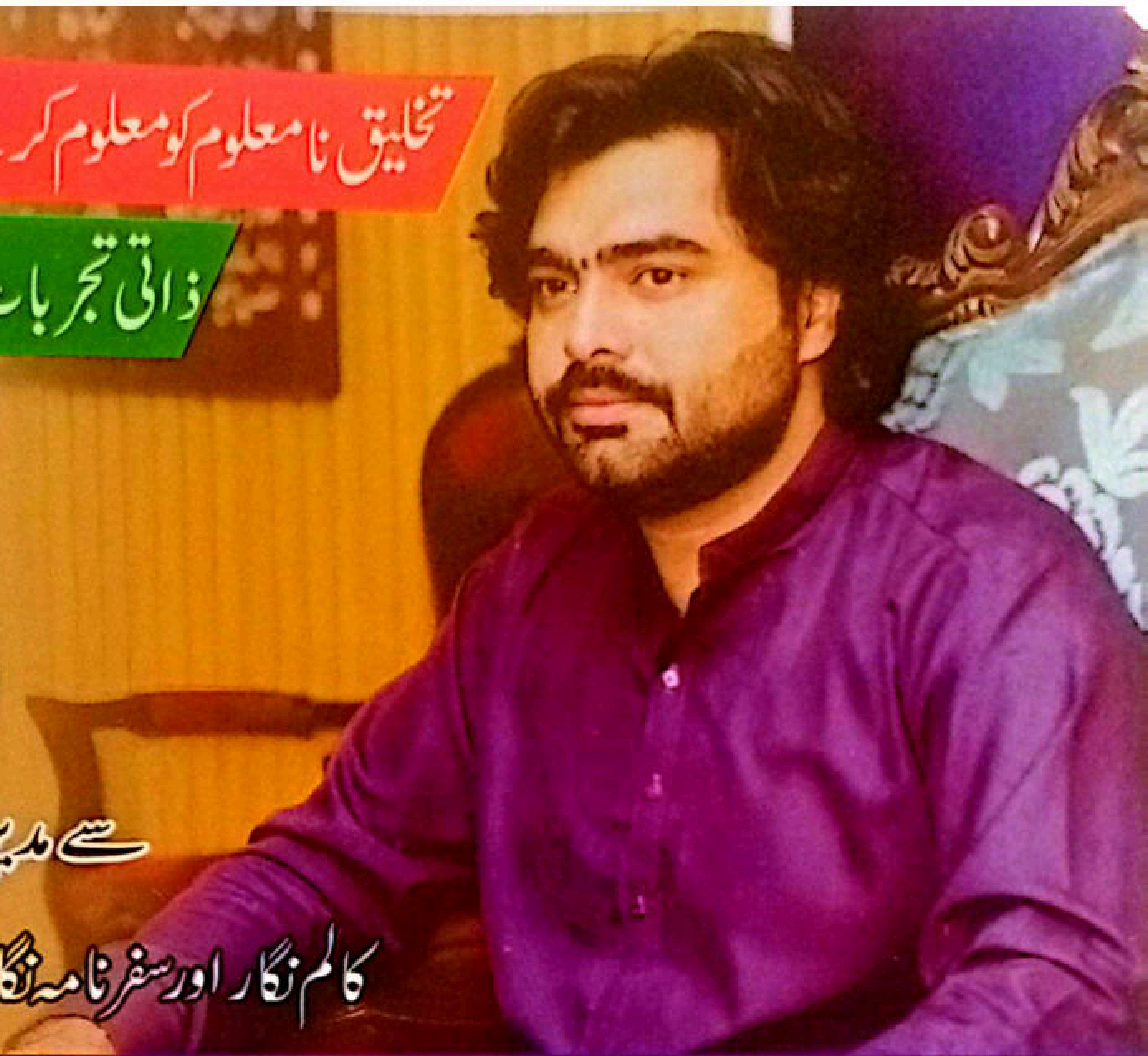

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

شہرت کا گراف اوپر نیچے ہونے پر کبھی خوشی اور غم محسوس نہیں کیا: دانش نقوی

دانش نقوی نئی نسل کے پسندیدہ شاعروں کی فہرست میں انتہائی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ سوشل میڈیا نے شعروسخن کی جن نئی آوازوں کو متعارف کروانے میں بنیادی کردار ادا کیا، دانش نقوی کا نام بھی ان خوش قسمت شاعروں میں آتا ہے۔ انتہائی خوبصورت شعر کہتے ہیں جس میں تازہ کاری نمایاں ہے۔ جنریشن زی میں ان کی مقبولیت بالخصوص بہت زیادہ ہے، جس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ نسل نو بھی ہماری تہذیبی شعری روایت سے کٹی ہوئی نہیں ہے، جو کہ بہر حال ایک حوصلہ افزا بات ہے۔ دانش نقوی جتنے اچھے شعر کہتے ہیں اتنی ہی خوبصورت گفتگو بھی کرتے ہیں۔ ہماری گزارش پر انہوں نے قارئین ارژنگ کے لیے مکالمے کا وقت دیا جس کے لیے سپاس گزار ہیں۔ ان سے ہونے والی گفتگو پیش خدمت ہے۔

س: بچپن کہاں گزرا؟ گرد و پیش کے حالات کیسے تھے؟

ج: میرا بچپن ضلع جھنگ کی ایک چھوٹی سی بستی جس کا نام سیالکوٹ ہے وہاں گزرا اور وہیں میرے تمام بزرگ مقیم تھے، شہر سے بہت دور بستی تھی تو سیدھا سادہ ماحول تھا، محبتی اور ملنسار لوگ تھے گھر کے مشرق میں قریبا نصف میل پہ ایک نہر بہتی تھی اور ارد گرد فصلیں وغیرہ تھی۔۔۔۔

س: ادب سے شوق کی ابتدا؟

ج: میرے پردادا حضور جھنگوچی زبان کے صوفی شاعر تھے ان کی دعائیہ نظمیں دادا ابو نماز کے بعد پڑھا کرتے تھے، تب میرا بچپن تھا دادا ابو گود میں لے کر بھی وہ نظمیں پڑھتا اور کبھی کبھی مزاق کے طور پر کہتے "دیکھو میرا ابا کتنا اچھا شاعر تھا تمہارا ابا اتنا اچھا شاعر ہے؟"۔ سو شعر اور شاعری سے تعارف اس عمر میں ہو گیا جس میں اکثر لوگوں کو یہ تعارف نہیں ہو پاتا۔

س: اوائل جوانی میں ہی شہرت پا جانا کیسا لگتا ہے؟

ج: یہ صرف اور صرف کرم والا معاملہ لگتا ہے۔ میرے قریبی احباب ضرور جانتے ہیں کہ میں نے شہرت کا گراف اوپر نیچے ہونے پہ کبھی بہت خوشی یا بہت دکھ محسوس نہیں کیا البتہ کرم کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔

س: کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔

ج: شروع میں بزم محسن نقوی نام کی ادبی تنظیم کا حصہ رہا ہوں بعد ازاں اکیلا رہنا مناسب سمجھا۔ میرے نزدیک اہل قلم کو ہی سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔

س: کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا ہے؟

ج: کسی حد تک درست بھی ہے لیکن کتاب کا نشہ جس کو لگتا ہے اس کو کبھی کوئی چیز کتاب سے دور نہیں کر سکتی۔

س: شعر و ادب کی ترویج میں مشاعرے کی کیا اہمیت اور کردار ہے؟

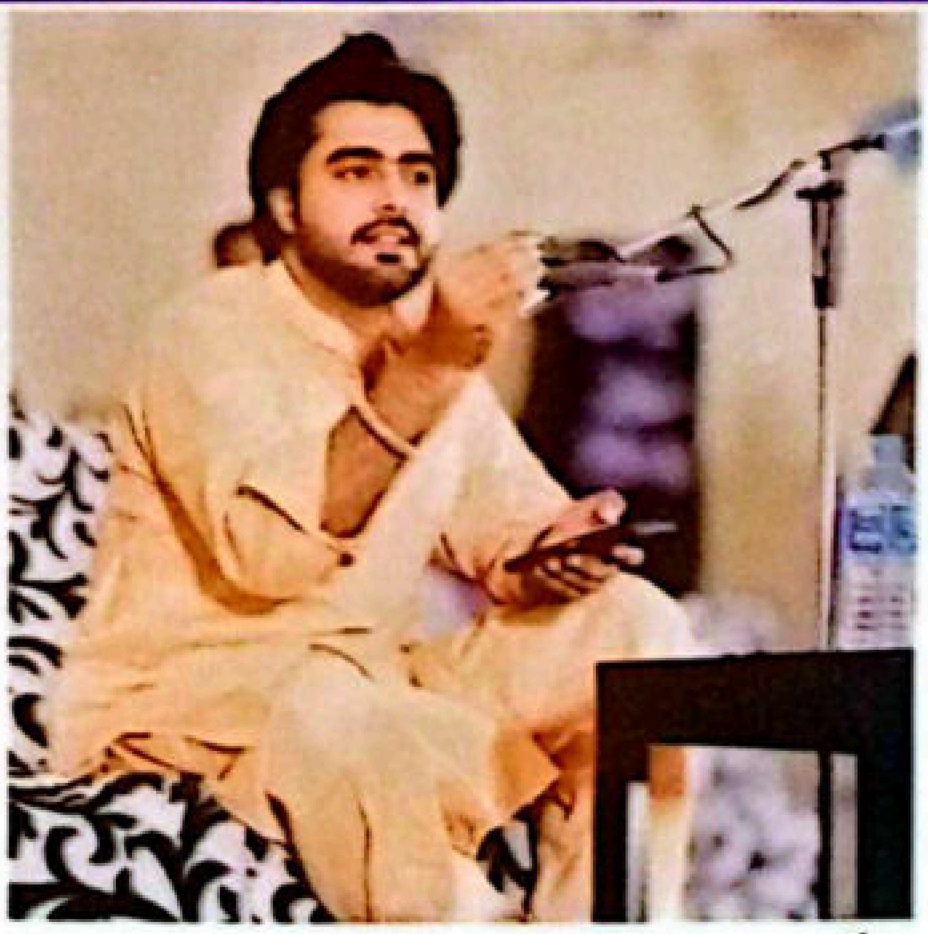

ج: مشاعرہ کبھی شعر و ادب کی ترویج کا کام کیا کرتا تھا لیکن اب کہیں نہ کہیں ایسا لگتا ہے کہ کسی چیز کی کمی ہے اور کسی چیز کی زیادتی ہے جو مشاعروں میں در آئی ہے۔

س: اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے؟ کون سی کتاب خود آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟

ج: میں نے فی الحال کوئی کتاب نہیں چھپائی۔

س: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج: تخلیق نامعلوم کو معلوم کرنے اور کروانے کی کسی صورت کا نام ہے اچھا تخلیق کار وہ ہے جو اپنی تخلیق کو جیتا ہے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

MONTHLY Arzang LAHORE

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

نومبر 2025ء جلد 26 شمارہ 11

مدیرِ اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

مجلسِ مشاورت
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پہ مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

نعت ' 2

مضامین:

- مجموعہ حمد و نعت "عود گر" / ریاض مجید ' 4
- قندیل رہبانی ' / ڈاکٹر علی محمد خاں ' 11
- اردو: حیرت انگیز انکشافات / رضا علی عابدی ' 15
- قیامِ امن اور ادیب / مبین مرزا ' 16

شعری گوشے: لیاقت علی عاصم ' میاں مزمل لطیف ' 18 تا 19

گوشۂ طنز و مزاح:

- ممتاز تشنہ صاحب سے ایک ملاقات / عطاء الحق قاسمی ' 20
- شاعروں کے تخیلات پر کچھ ادبی اجتہاد / امجد محمود چشتی ' 22
- سپاہی سے ڈپٹی کمشنر تک (تصنیف عبدالغفور چودھری) / لیاقت بلوچ ' 24
- لفظ "خانہ پوری" اور "دن بہ دن" میں کیا غلطی ہے؟ / اطہر ہاشمی ' 26
- بلونت سنگھ کے شاہکار افسانے / دانیال حسن چغتائی ' 28
- جدید اُردو شاعری میں تنہائی کا استعارہ / لبنیٰ صفدر ' 30
- شاعرو! عوامی اصلاح سے بچو / ظفر سیّد ' 33
- "ہندکو رحل" عبدالوحید بسمل کا تہذیبی کارنامہ / قمر زمان ' 35
- نوبیل انعام اور پاکستان کا گم ہوتا ہوا ادبی شعوری / فرقان علی ' 37
- میلکم براینٹ (انگلینڈ) - تعارف ورجینیا وولف / حسن عباسی ' 39
- عشق میں طارق جاوید کا نیا قیام / منیر احمد راہی ' 41
- بقیہ انٹرویو: دانش نقوی ' 43
- بقیہ انٹرویو: انور ندیم علوی ' 44

افسانے:
- نادیدہ / عالیہ ذوالقرنین ' 47
- پانچ دروازے / منیر احمد فردوس ' 49

سفرنامے:
- ہمبر سٹون / عامر بن علی ' 51
- ٹاور آف لندن / فقیر اللہ خاں ' 53
- تبصرۂ کتب ' 54
- ادبی تقریبات ' 56

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد

وہ خالقِ افلاک و زمیں اِنس و ملک ہے
دارین تو اس حُسنِ فراواں کی جھلک ہے
یکتائی میں بے مثل ہے، اوصاف میں کامل
اس ذات کی تقدیس میں نہ عیب نہ شک ہے
ہے پردہ اسرار میں بھی جلوہ فگن وہ
اس نورِ سماوات سے آنکھوں میں چمک ہے
گل بار ہر اک شاخ ہے اس ذات کا مظہر
اِس گلشنِ ہستی میں فقط اُس کی مہک ہے
شہ رگ سے قریں دل میں مکیں ذات ہے اُس کی
وہ خون میں شامل ہے وہی روح تلک ہے
محتاجِ کرم تارِ سخن اس کی ہے لَو کا
اقلیمِ تخیّل میں فقط اس کی لپک ہے
تسبیح میں مشغول ہیں رنگین نظارے
گلشن میں گُلِ تر ہے فضاؤں میں دھنک ہے
دریا میں ترنگ اس کی ہے صحرا میں خموشی
کہساروں میں ہیبت ہے تو جھرنوں میں چھنک ہے
ہیں شمس و قمر اس کے ہی جلوے سے منوّر
تابندہ ستاروں میں ظفر اُس کی لہک ہے

انجینئر ظفر محی الدین/ لاہور

خصائلِ نبویؐ بمطابق حدیثِ نبویؐ

پوچھا جب مولا علیؓ نے کیا ہے سنّت آپؐ کی
آپؐ نے یوں کی بیاں، جو ہے حقیقت آپؐ کی
معرفت ربِ عُلا کی آپ ﷺ کا ہے راسِ مال
عقل ہی تو اصلِ دیں ہے فی الحقیقت آپؐ کی
صبر ہے اُنؐ کی ردا تو ذکرِ اللہ ہے انیس
ہے محبت ہی اساسِ دین و سیرت آپؐ کی
شوق ہی مَرکب تھا دائم آپؐ کا ہر کام میں
شوق سے قائم رہی کاموں میں رغبت آپؐ کی
ہے خزانہ آپؐ کا دنیا میں دائم اعتماد
بس رَضا ربِ عُلا کی ہے غنیمت آپؐ کی(۱)
عِلم ہے ہتھیار تو ہے حُزن ساتھی آپؐ کا
عجز ہے فخر آپؐ کا تو زُہد حرفت آپؐ کی(۲)
خُلق ہے اُنؐ کا جہاد اِس کار زارِ زیست میں
اور ہے پہچان خالق کی اطاعت آپؐ کی
آپؐ نے فرما دیا کہ راحتِ جاں ہے نماز
ہے یقیں طاقت، صداقت ہے شفاعت آپؐ کی
حاملِ خُلقِ عظیم و حاملِ قرآں ہیں آپؐ
جانتا ہے خود ہی خالق بس حقیقت آپؐ کی

(۱)غنیمت۔ مراد اصل دولت یا خزانہ۔
(۲) لفظ حرفت حدیث پاک میں استعمال کیا گیا ہے۔اس سے مراد علم و ہنر، خوبی یا وصف ہے۔

اس حدیث کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔اس کا حوالہ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الشفاء میں دیا ہے۔قاضی سلیمان سلمان، منصور پوری نے اپنی کتاب رحمۃ للعالمین جلد سوم صفحہ پر یہ حدیثِ مبارکہ درج کی:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللهِ ?عَنْ سُنَّتِهِ فَقَالَ الْمَعْرِفَةُ رَاسُ مَالِيْ وَالْعَقْلُ اَصْلُ دِيْنِيْ وَالْحُبُّ اَسَاسِيْ وَالشَّوْقُ مَرْكَبِيْ وَذِكْرُ اللّٰهِ اَنِيْسِيْ وَالثِّقَةُ كَنْزِيْ وَالْحُزْنُ رَفِيْقِيْ وَالْعِلْمُ سَلَاحِيْ وَالصَّبْرُ رِدَائِيْ وَالرِّضَاءُ غَنِيْمَتِيْ وَالْعِجْزُ فَخْرِيْ وَالزُّهْدُ حِرْفَتِيْ وَالْيَقِيْنُ قُوَّتِيْ وَالصِّدْقُ شَفِيْعِيْ وَالطَّاعَةُ حَسْبِيْ وَالْجِهَادُ خُلُقِيْ وَ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ

(الشفاء: حصہ اول: ص۔قاضی عیاض مالکی۔ناشر: سنی دارالاشاعت علویہ رضویہ فیصل آباد۔سیرۃ النبی کا انسائیکلو پیڈیا۔جلد دوم ،صفحات،،۔سید قاسم محمود۔ناشر، الفیصل ،اردو بازار لاہور)

نوٹ:۔سیّد قاسم محمود نے اس حدیثِ پاک کا ترجمہ لکھتے ہوئے غلطی سے یہ لکھ دیا طاعت میری خُلق ہے جبکہ حدیث شریف میں یہ فرمایا گیا ہے والجہاد خلقی (جہاد میرا اُخلق ہے)۔

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/ لاہور

آنکھوں میں بسایا ہے مدینہ مرے آقاؐ
اب کھول کے بیٹھا ہوں یہ سینہ مرے آقاؐ
کب تک میں اندھیروں میں بھٹکتا ہی رہوں گا
مل جائے مجھے دیدۂ بینا مرے آقاؐ
دریا کے مسافر کی یہی ایک دُعا ہے
بس پار لگا دیں یہ سفینہ مرے آقاؐ
جو کچھ بھی ملا آپؐ کی نسبت سے ملا ہے
دنیا نے تو ہر چیز کو چھینا مرے آقاؐ
کہتے ہیں وہاں خاک بھی سونے کی طرح ہے
مجھ کو بھی عطا ہو یہ خزینہ مرے آقاؐ

نوید مرزا/ لاہور

کیسا عالی مقام ہے اُنؐ کا
وصف خیرالانام ہے اُنؐ کا
ہر زمانے پہ اُنؐ کا لطف و کرم
ہر زمانہ غلام ہے اُنؐ کا
کیسا بے مثل اُن کا طرزِ عمل
کیا مکمل نظام ہے اُنؐ کا
ہو گئی ختم خواہشِ دُنیا
جب سے دل میں قیام ہے اُنؐ کا
کیا حلیمی عطا ہوئی ہے اُنہیں
کیسا دل کش کلام ہے اُنؐ کا
آنسوؤں میں ہے اُن کی یاد رواں
خوشبوؤں میں خرام ہے اُن کا
بزمِ امکان میں ازل سے رضا
تذکرہ صبح و شام ہے اُنؐ کا

علی رضا/ساہیوال

کہاں مجال مری ، آپؐ کی ثنا لکھوں
جو اِذن ہو تو نہ جانے میں کیا سے کیا لکھوں
اگرچہ ایک ہیں لیکن جدا ، جدا لکھوں
نبیؐ، نبیؐ ہی لکھوں اور خدا ، خدا لکھوں
ہر اِک صدی کو لکھوں آپؐ کی صدی آقاؐ
ہر اک زمانہ ، زمانہ ہے آپؐ کا لکھوں
کتابِ خیر میں اللہ نے کہا ہے مجھے
کوئی نبی بھی نہیں اور آئے گا ، لکھوں
شبِ عروج ، ہر اِک اِنکشاف بول اُٹھا
جبینِ اِنس پہ احمدؐ کو مجتبیٰ لکھوں
کہے تمام جہانوں کا پالنے والا
اُنہیںؐ تمام جہانوں کا پیشوا لکھوں
سلام کر کے محمدؐ کے نام میں آکاشؔ
درود پڑھنے لگوں جب بھی مصطفیٰ لکھوں

احمد سبحانی آکاش/لاہور

شمع توحید کی سرکار جلانے آئے
یعنی ظلمات کا ہر نقش مٹانے آئے
میں نے ہونا تھا محمدؐ کا سو میں ہو بھی چکا
ایسے بے کار میں دنیا مجھے پانے آئے
جب بھی دھتکار کے دنیا مجھے تنہا کر دے
آپؐ کی یاد مجھے دل سے لگانے آئے
نعت کہنا تھی ''کہا'' صلی علیٰ سیدنا
لفظ یک دم لیے نعتوں کے خزانے آئے
آپؐ ہی تو شبِ یلدا کے قفس سے آخر
صبح بے تاب کو آزاد کرانے آئے
کون سی خلق ہے طیبہ جو نہ آتی ہوگی
ہر کوئی دل کی یہاں پیاس بجھانے آئے
کاش سو جاؤں انھیں یاد میں کرتے ہوئے شمسؔ
اور طیبہ کی ہوا مجھ کو جگانے آئے

زاہد محمود زاہد/ملتان

اللہ کے معتبر منتظر، مرحبا
نبیوں کے مقتدر تاجور ، مرحبا
حشر میں ، شافعِ عصیاں گر ، مرحبا
مرحبا ، آقا خیر البشرؐ ، مرحبا
آفتابِ رسالت پہ لاکھوں سلام
آمنہؓ کے اے نورِ نظر! مرحبا
زہراؓ کے عالی رُتبہ پدر! مرحبا
جن و انساں کے اے چارہ گر! مرحبا
ملتمس ہم ، کرم ہو ادھر ، مرحبا
تیری چشمِ عنایت پہ لاکھوں سلام
گالیاں سن کے بھی درگزر ، مرحبا
کھائے زخم اور طائف بدر ، مرحبا
بحرِ رحمت رہا جوش پر ، مرحبا
جملہ اوصافِ خیر البشرؐ ، مرحبا
پیکرِ خلق و سیرت پہ لاکھوں سلام
پنکھڑی سے لبِ خوبتر ، مرحبا!
خالِ رُخ ، زیبا رُخ ، وہ نظر مرحبا
کالی کالی سی زُلفیں بہ سر ، مرحبا
سر و قامت کی شوکت ، ظفر ، مرحبا
اور چالِ نزاکت پہ لاکھوں سلام
چومیں جن کے فلک نقشِ پا ، مرحبا
وہ گئے عرش پر مصطفیٰ ، مرحبا
واللہ ہیں وہ حبیبِ خداؐ مرحبا
وہ امامِ صفِ انبیاء ، مرحبا
منصبِ شرف و عزت پہ لاکھوں سلام
تیری یادوں میں دن اور راتیں مری
اور ثمرور رہیں مدح و نعتیں مری
تیرے صدقے ہی معروف باتیں مری
تیرے ہی نام منسوب نعتیں مری
ایسے ذوقِ عقیدت پہ لاکھوں سلام
سب ملائک کا بھی ، کبریا کا بھی وِرد
اور ''صلِ علیٰ'' اولیاء کا بھی وِرد
مرحبا ، مومنِ باوفا کا بھی وِرد
زائرؔ بے نوا ، بے ادا کا بھی وِرد
''مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام''

عبدالقیوم زائر/امریکا

مجموعہ حمد و نعت "عودنگر"

ریاض مجید/فیصل آباد

عودنگر جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کا مجموعہ حمد ونعت ہے ۔میاں صاحب کا تعلق قانون اور عدل وانصاف کی دنیا سے ہے ۔وہ اعلیٰ عدالتوں میں ممتاز قادری شہید کی طرف سے بطور وکیل صفائی پیش ہوئے ۔ انہوں نے عدالتوں میں بحث اور فیصلوں کے حوالے سے ایک گراں قدر دستاویزی تصنیف حاضری سے حضوری تک اور ایک مختصر کتاب تحفظِ ناموسِ رسالت۔عقیدہ اور قانون شائع کروائیں۔ یہ دونوں آثار اُن کی مذہبی، علمی اور تہذیبی شخصیت اور تربیت کے امین ہیں ۔ان کی ذات اسلامی شعائر اور سرکارِ رسالت مآب ﷺ سے جو عقیدت اور وابستگی رکھتی ہے اس کا اظہار مذکورہ بالا تصانیف کے ورق ورق سے ہوتا ہے ۔اب عودنگر کے نام سے ان کی عقیدت نگاری (Devotional Poetry) شائع ہورہی ہے جو حمد،نعت اور چند منظومات پر مشتمل ہے۔

واضح رہے کہ اختر اُن شاعروں میں سے ہیں جن کے لئے نعت نگاری عبادت کا درجہ رکھتی ہے شہرت و ناموری اُن کا مقصد نہیں وہ اپنی تخلیقی تنہائیوں میں گاہے گاہے جو حمدیں اور نعتیں لکھتے رہے ہیں اب اُس مبارک اثاثے کو عودنگر کے نام سے شائع کررہے ہیں۔اُن کی جدتِ طبع کا اندازہ اس مجموعے کے نام ہی سے ہوتا ہے ۔مدینہ منورہ کو سینکڑوں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔سیرت کی کتابوں میں اس کے بیسیوں نام ملتے ہیں۔حضور نبی اکرم ﷺ کی مدینہ پاک میں تشریف آوری سے پہلے اسے یثرب کہا جاتا تھا جس کا لغت میں معنی ہے کہ ایسی جگہ جو آلودہ ہو یا جہاں انسان بیماریوں کا شکار ہوجائے ۔اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول مقبول ﷺ مدینہ تشریف لائے تو کرہ ارض پر اس سے زیادہ بیماریوں سے اٹا ہوا کوئی اور خطہ نہیں تھا۔حضور ﷺ کی آمد کے بعد یہی خطہ جنت نظیر بن گیا۔اس کی فضا اور ہوا باعثِ خیر و برکت اور اس کی تراب باعثِ شفا بن گئی ۔اللہ کریم نے یثرب کا نام بدل کر طابہ اور المدینہ کر دیا اور حضور ﷺ نے اس کے نام بطحا وطیبہ بھی رکھے اور اسے یثرب کہنے کی ممانعت کردی۔حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسے یثرب مت کہو بلکہ طیبہ کہو۔جو بھی اسے یثرب کہےاس پر واجب ہے کہ وہ اللہ رب العزت سے تین بار استغفار کرے، یہ طیبہ ہے، یہ طیبہ ہے ۔یہ طیبہ ہے۔(الدرالمنثور : جلد ص۔کنزالعمال : جلد ص۔مجمع الزوائد: جلد ص ۳۰۰)

ان کے علاوہ شاعروں نے بھی مدینہ منورہ کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے جیسے مدینہ منورہ، شہرِ رسول، قریہ رقّت نواز، شہرِ خنک، شہرِ خوبی، دیارِ رحمت، احترام آباد، شہرِ حبیب وغیرہ ۔اب اس فہرست میں عودنگر کا بھی اضافہ ہورہا ہے۔

نذیر اختر نے مدینہ کی فضا خصوصاً روضہ نبوی ﷺ اور اس کے نواح کی خوشبو کو اس نام میں سمیٹا ہے۔ زائرینِ مدینہ نے شہرِ رسول کے ظاہری آثار پر بہت کچھ لکھا۔مسجد نبوی ﷺ، مینار، گنبدِ خضرا، مواجہ شریف، مسجدِ قبا، جنت البقیع ،احد __ مدینہ کے کوچہ وبازار، وہاں کی ہوائیں، فضائیں اور بہت سے دیگر متناسباتِ مدینہ پر بہت شاعری ہوئی اور ہو رہی ہے کہ متناسبات و متعلقاتِ مدینہ ہمیشہ سے ہماری نعتیہ شاعری کا حصہ ہیں ۔وہاں کی خوشبو کی عمومی کیفیت پر بھی کئی شعر مل جاتے ہیں۔عنبر، مشک وغیرہ کے ساتھ اس ماحول میں عطریات اور خوشبویات کے ذیل میں عود کا لفظ بھی کہیں کہیں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ مگر خصوصیت سے عود کے حوالے سے وہاں کی مہک کی خاص انفرادی اثر پذیری کی بات ہماری نعتیہ شاعری میں کم کم ہوئی ہے۔عودنگر میں عود کے خصوصی اظہار کو خوشبو شناس اور نکہت آشنا زائرین مدینہ نے جس جذب اور گہرائی سے محسوس کیا ہے اس کی کیفیت جداگانہ تاثر رکھتی ہے۔

میاں نذیر اختر کے مجموعہ حمد ونعت کا عنوان عودنگر رکھا جانا بہت توجہ طلب اور لائقِ تحسین ہے۔انہوں نے اس نام میں شہرِ نبی ﷺ کے ماحول کے جمالیاتی حسن اور دیارِ رسول کی فضا کو جو معطر نام دیا ہے وہ نعت کے باب میں چھپنے والے شعری مجموعوں میں انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ یہ نام ان کے اس شعر میں موجود ہے

اے عودنگر، رشکِ ارم ، شہر مدینہ
فردوس کی خوشبو ہو ترے نام کے صدقے

عود کے نام کے شمول سے دو نعتیہ شعری مجموعے پہلے بھی شائع ہوئے ہیں۔ایک کا نام عودِ سخن (مطبوعہ مکتبہ المنیرہ، کراچی، ۲۰۰۶ء) ہے جو خیال آفاقی کا نعتیہ مجموعہ ہے اور دوسرا عودِ گلستانِ رسول ﷺ (مطبوعہ فروغ ادب اکادمی، گوجرانوالہ، ۲۰۰۶ء)، سلیم اختر فارانی کا ہے۔عود نام کی حامل اس کتاب کی انفرادیت کا حق ہے کہ کچھ باتیں مرکزِ محورِ نعت، حضور نبی اکرم ﷺ کے فرامین اور (عود کی) خوشبو کے

حوالے سے کی جائیں۔

معروف مذہبی سکالر مارٹن لنگز۔ (Martin Lings) جن کا اسلامی نام ابوبکر سراج الدین ہے، کی ایک معروف کتاب What is Sufism? (تصوف کیا ہے؟) کے نام سے چھپی (۱)۔ اس کتاب کے آغاز میں مصنف نے اُس حدیث رسول ﷺ کا حوالہ دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ نماز، عورت (بیوی) اور خوشبو کو میرے لئے پسندیدہ بنا دیا گیا ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا: اَ لنِّسَاءُ وَالطِّیْبُ، وَجُعِلَ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِیْ الصَّلوٰۃِ) مجھے دنیا میں عورتیں (بیویاں) اور خوشبو پسند ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ (سنن النسائی: حدیث۔ جلد۔ص۔ کتاب عشرۃ النساء، باب حُبّ النساء۔ مطبوعہ۔ فرید بک سٹال اُردو بازار لاہور۔ وسندہ حسن، مسند احمد روسندہ حسن وحسنہ الحافظ ابن حجر فی التلخیص الحبیر ر ح واوردہ الضیاء فی المختارۃ ر ح)۔ دوسری روایت میں ہے: (حُبِّبَ اِلَیَّ النِّسَاءُ وَالطِّیْبُ وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِیْ الصَّلوٰۃِ) مجھے عورتیں (بیویاں) اور خوشبو پسند ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ (ایضاً: حدیث: ....۔ وسندہ حسن وصححہ الحاکم علیٰ شرط مسلم ر، ووافقہ الذہبی)۔ عربی زبان میں خوشبو کو ریحِ طَیِّب بھی کہتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کو بالخصوص مشک، عنبر اور عود کی خوشبو محبوب تھی۔ بعض عود شناس حضرات نے سیرت رسول اکرم ﷺ کے حوالے سے خوشبو کی علامتی حیثیت اور صوفیانہ نظام فکر میں اس کی اہمیت اور تاثیر کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے وہ حدیث اور سیرت کی عام کتابوں میں اس انداز سے نہیں ملتی اہلِ جذب نے خوشبو کی علامت کو صوفیانہ مشاغل، اذکار اور اس کے تعلق کو بڑے منفرد انداز میں ظاہر کیا ہے۔

حرمین شناس، طیّب و طاہر، زائر اور خوشبو شناس طبع کے حامل اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ حرمِ کعبہ اور حرم نبوی ﷺ کی خوشبوؤں میں کچھ فرق ہے یہاں کچھ کا لفظ غور طلب ہے ان خوشبوؤں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بیان کرنا قریب قریب ناممکن ہے غلاف کعبہ اور حجر اسود کے نواح کی خوشبو مواجہ شریف کی خوشبو سے کچھ مختلف ہے۔ حرمِ کعبہ سے باہر کی دوکانوں پر اس سے ملتی جلتی خوشبو چھوٹی بڑی شیشیوں میں دستیاب بھی ہے یہ مشک (Musk) کی کوئی شکل ہے تیز اور جلالی اثرات کی حامل اسے عام طور پر Dilute کر کے استعمال کیا جاتا ہے سردیوں میں اس کے اثرات اور طرح کے ہوتے ہیں جبکہ گرمیوں میں اور۔ مدینہ شہر بالخصوص نواحِ حرم نبوی میں عود کی خوشبو نمایاں ہوتی ہے حرم نبوی ﷺ کے نواحی علاقے کی گلیوں کی دُکانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ طبیعت پر اس کے اثرات جمالی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اور لوگوں کے تاثرات مجھ سے بالکل مختلف ہوں لیکن مجھے دوسری خوشبویات و عطریات کے علاوہ مکہ میں مشک اور مدینہ منورہ میں عود کی خوشبو کے تاثرات نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔

عودنگر کا پہلا حصہ حمد باری تعالیٰ پر مشتمل ہے۔ میاں صاحب کی حمد نگاری، سلاست زباں کے ساتھ افکار کی بلاغت لائق تحسین ہے۔ انہوں نے حمد کے باب میں قرآنی آیات کی نشاندہی بعض جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں کی ہے۔ ان کے یہ شعر دیکھئے:۔

وہ ہے غیب و ظاہر عوالم کا عالم
جہاں اَن گنت جو بنائے خدا نے
زمیں کو بہت خوب رب نے بچھایا
جبال اس پہ ہر جا جمائے خدا نے
خلاوں کی تسخیر اِمکاں سے باہر
کروڑوں ہی عالم بنائے خدا نے

یہ طویل حمد 114، اشعار پر مشتمل ہے۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ یہی تعداد قرآنی سورتوں کی ہے۔

عودنگر میں بعض اشعار نعت نگار کی قرآن فہمی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کا یہ شعر دیکھئے:

زمیں رَتْق پہلے سماوات سے تھی
فَتْق کے نظارے دکھائے خدا نے

سورۃ الانبیا کی آیت: ۳۰ (اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ) میں رتق اور فتق کے الفاظ کی معنویت کے تلازمات اور تشریحات کا سلسلہ آج کے سائنسی نظریے بگ بینگ (Big Bang) سے جا ملتا ہے۔

عودنگر کی نعتیہ شاعری کا محور حبِّ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت اطہر، ذات والا تبار، آپ ﷺ کے معجزات، آپ ﷺ کے فضائل و کردار کے ساتھ، آپ ﷺ کے فیوض و برکات کا اظہار، عودنگر کے شاعر نے جس محبت اور احترام کے ساتھ کیا ہے اس کا رشتہ اطاعت رسول کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ نعت میں تاثیر، حبِّ اطاعت سرشت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یوں تو اس کے نمونے پوری کتاب میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن وہ شاعری جو

انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کے حوالے سے کی ہے نا صرف محاکاتی تاثیر لئے ہوئے ہے بلکہ سیرتِ طیبہ کے کئی پہلوؤں کی عکاس بھی ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھئے جن میں آپ ﷺ کے موئے مبارک کے تناظر میں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے کئی گوشے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

صد شکر عطا مجھ کو ہُوا موئے مبارک
ہے خاص مرے رب کی عطا موئے مبارک
رہتا ہے مرے گھر میں مدینہ کا مسافر
ہے باعثِ برکات و بہا موئے مبارک
یوں شاملِ خدّامِ نبی ﷺ ہو گیا اخترؔ
خدمت تری اعزاز مرا موئے مبارک
ہے حاملِ درجات عُلا موئے مبارک
تعظیم کا حق دار سدا موئے مبارک
ہے آیۂ لولاک کے مفہوم میں داخل
اللہ نے دی تجھ کو بقا موئے مبارک
اِک عمر ملا لمس تجھے دستِ نبی ﷺ کا
جب ریشِ نبی ﷺ میں تو رہا موئے مبارک
ہجرت کے مراحل ہوں کہ معراجِ نبی ﷺ ہو
تھے ہمسفرِ ثور و حرا موئے مبارک
ہر آن رفاقت اِسے آقا ﷺ کی ملی تھی
سدرہ سے ورا ساتھ رہا موئے مبارک
دیکھے گی کبھی آپ ﷺ کا وہ رُوئے مبارک
جس آنکھ نے بھی، دیکھ لئے موئے مبارک

میاں نذیر اختر نے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی تصویر کشی کی ہے مجھے اردو نعت کے معاصر منظر نامے میں ایسی تصویر کشی کہیں نظر نہیں آتی۔ اردو نعت میں کہیں کہیں رسولِ اکرم ﷺ کے سراپا کے ذیل میں یا گوئے نبی ﷺ، سوئے نبی ﷺ، خوشبوئے نبی ﷺ کی حامل ردیفوں میں موئے نبی ﷺ کے حوالے سے اکا دُکا شعر ضرور ملتے ہیں مگر عودنگر میں موئے مبارک کے موضوع پر شعر جس محبت اور کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ عودنگر کا نمایاں اعزاز ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عودنگر کے نعت نگار کے ہاں موئے مبارک کا ذکر شنیدہ نہیں دیدہ کا اعتبار اور افتخار رکھتا ہے اس کی وضاحت انہوں نے اس موضوع پر لکھی گئی نعتوں سے قبل کر دی ہے۔ عودنگر کا یہ مختصر سا حصہ جو موئے مبارک سے متعلق ہے، نذیر اختر کی شاعری میں ہی نہیں بلکہ اردو کی پوری نعتیہ شاعری میں اہمیت کا حامل ہے۔

عودنگر کے نعتیہ کلام کا ایک اور نمایاں پہلو نعت نگار کی وہ شاعری ہے جو عقیدہ ختم نبوت اور قادیانیت کے موضوع پر ہے۔ یہ مسئلہ بھی ان کے نزدیک سرسری نہیں اہم حیثیت کا حامل ہے۔ ہمارے کچھ نوجوان شاعر عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت کو سرسری انداز میں لیتے ہیں جو مناسب نہیں۔ اس مسئلہ کو تاریخی تناظر میں تفصیل سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے بہت سے مذہبی دانشوروں اور علمائے کرام نے اس مسئلہ کے بارے میں تاریخی دستاویزات اور اس بارے قومی اسمبلی کے فیصلے کے بارے میں بہت سا لٹریچر مرتب کیا ہے جو بآسانی دستیاب بھی ہے۔ ہر نعت نگار کو اسے ایک نظر دیکھنا چاہیے۔

میں پہلے بھی دو تین کتابوں کے دیباچوں میں عقیدہ ختم نبوت کا پس منظر بیان کر چکا ہوں۔ مختصراً عرض ہے کہ برصغیر میں اپنے قدم جمانے کے لئے انگریز نے مسلمانوں کے تصورِ جہاد کو (نعوذ باللہ) ختم کرنے کے لئے ایک باقاعدہ منصوبہ بندی سے قادیانیت کے شجرِ خبیثہ کی آبیاری کی۔ مَیں نے لا نبی بعدی (مرتبہ یونس امین) کے دیباچے میں اس مسئلہ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک دور میں برطانوی حکومت نے ایک وفد تشکیل دیا۔ اس وفد نے "The Arrival of British Empire in India" (ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی آمد) کے عنوان سے دو رپورٹیں لکھیں، جن میں انہوں نے لکھا: ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے روحانی اور مذہبی پیشواؤں کی اندھا دھند پیروکار ہے۔ اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جو الہامی سند پیش کرے تو ایسے شخص کو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا کر اس سے برطانوی مفادات کے لیے مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ بقول ڈبلیو ولیم ہنٹر (W.W.Hunter) ہماری مسلمان رعایا سے کسی بھی پُر جوش وفاداری کی توقع رکھنا عبث ہے۔ تمام قرآن مسلمانوں کے بطور فاتح، نہ کہ مفتوح کے طور پر تصورات سے لبریز ہے۔ مسلمانانِ ہند ہندوستان میں برطانوی راج کے لیے ہمیشہ کا خطرہ ہو سکتے ہیں۔ انگلستانی وفد کی رپورٹ (Report of Missionary Fathers) ملاحظہ کیجئے:

"Majority of the population of the country blindly follow their "Peers" their spiritual leaders. If at this stage, we succeed in finding out some person who would be ready to declare himself a zilli Nabi (apostolic prophet(then the large number of people shall rally around him. But for this purpose,

it is very difficult to persuade some one from the Muslim masses. If this problem is solved the prophethood of such a person can flourish under the patronage of the Government. We have already overpowered the native governments mainly pursuing a policy of seeking help from the traitors. That was a different stage, for at that time, the traitors were from the military point of view. But now when we have sway over every nook of the country and there is peace and order everywhere we ought to undertake measures which might create internal unrest among the country."

(Extract from the printed report. India office library, London)

ترجمہ :ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے پیروں اور روحانی راہنماوں کی اندھی تقلید کرتی ہے۔ اگر اس موقع پر ہمیں کوئی ایسا شخص مل جائے، جو ظلی نبوت (حواری نبی) کا اعلان کر کے، اپنے گرد پیروکاروں کو اکٹھا کرے لیکن اس مقصد کے لیے اس کو عوام کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا، اس شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا کر برطانوی حکومت کے لیے مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ہم نے مقامی حکومتوں کو پہلے ہی ایسی ہدایات دی ہوئی ہیں کہ غداروں سے معاونت حاصل کی جائے، اس وقت مسلح غداری ہوئی تھی اور صورتِ حال اور تھی، اب جبکہ ہم نے ملک کے طول وعرض پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے اور ملک میں ہر جگہ امن وامان ہے، ہمیں ایسے اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے جو ملک میں اندرونی شورش پیدا کریں۔

بحوالہ کتاب The Indian Musalmans (مطبوعہ رپورٹ سے ایک اقتباس:انڈیا آفس لائبریری،لندن)

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ میاں نذیر اختر کی نعتیہ شاعری کا ایک نمایاں پہلو عقیدہ ختمِ نبوت کا تحفظ اور اظہار ہے۔اس مسئلہ کو میاں صاحب نے بڑی قوت اور تکرار کے ساتھ اپنی نعت کا موضوع بنایا ہے ان کی نظم عقیدہ ختم نبوت میں اس کا اظہار بڑا پُر تاثیر ہے۔میاں نذیر اختر ردِّ قادنیت کی تاریخ اور اس اہم مسئلہ سے خود بھی وابستہ ہیں اور اس ضمن میں انہوں نے ذاتی طور پر بڑا کام کیا ہے۔لہٰذا وہ اس کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں ان کی نعتیہ شاعری میں اس مسئلہ کو شدت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔یہ شعر دیکھئے:

دروازہ خود جو بند نبوّت کا رب کرے
کذاب ہے جو دعویٰ نبوّت کا اب کرے
مفہوم جس نے سمجھا اطیعُوا الرّسُول کا
دجال و مفتری کی اطاعت وہ کب کرے؟
پا کے نئی نبوّت کوئی نہ آئے گا
اب یہ مقام عظمت کوئی نہ پائے گا
جاری رہے گی دائم سرکار ﷺ کی نبوّت
تا حشر اب یہ نعمت کوئی نہ پائے گا
جو شخص اب جہاں میں نبوّت کا مدعی ہے
سمجھو کہ وہ ہے کاذب لاریب مفتری ہے
اس سے طلب نہ کرنا دعوے کی تم علامت
لازم ہے کفر اس سے ایماں کی رُخصتی ہے
لکھی گئی لہو سے وہ ایسی کتاب ہے
جنگِ یمامہ ختمِ نبوّت کا باب ہے
ثابت کیا عمل سے صحابہ کرامؓ نے
کرنا جہاد حُبِّ نبی ﷺ کا نصاب ہے

ہمارے کئی روشن خیال دوست اور نئے نعت نگار اس مسئلہ کو معمولی مسئلہ سمجھتے ہیں جبکہ ختمِ نبوت امتِ مسلمہ کا اجماعی اور بنیادی عقیدہ ہے۔عصرِ حاضر میں اس عقیدہ کے تحفظ اور اس کی تشہیر کی ہمہ پہلو ضرورت ہے۔نثر، شاعری، باہمی گفتگو اور مجالس میں اس مسئلہ کو شائستگی سے زیرِ بحث لانا آج کے ہر نعت نگار کی ذمہ داری ہے۔میاں صاحب نے اس ذمہ داری کو نبھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

نعت کے فکر وفن اور موضوع کے حوالے سے ان کے یہ اشعار دیکھئے:

دِل کو رکھنا حُبِّ دنیا سے ہمیشہ بے نیاز
فکرِ عقبیٰ کی سدا کرنا بھی اُن ﷺ کی نعت ہے
بخش دینا سنگ باری کرنے والوں کو ہے نعت
اپنے اعدا کو دُعا دینا بھی اُن کی نعت ہے
نعت ہے لفظوں میں توصیفِ نبی ﷺ کرنا بیاں
وصف کو سیرت بنا دینا بھی اُن ﷺ کی نعت ہے

وصف کو سیرت بنا دینا کیا خوبصورت اظہار ہے۔اس نعت میں میاں نذیر اختر نے مختلف زاویوں سے سیرت اور نعت کے فن کی ہم آہنگی اور ارتباط کی مثالیں پیش کی ہیں۔اس نعت میں نعت نگاری کے محرکات ومقاصد جس انداز میں پیش کئے گئے ہیں اس

سے یہ نعت پارہ نعت نگاری کے منشور کی سی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں قول کی اہمیت کا قائل ہونے کے ساتھ عمل کی فضیلت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

نذیر اختر کی نعت نگاری میں سیرت حضور ﷺ کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں ان کے یہ اشعار دیکھئے:

ہاں آپ نے اصحاب کو دی جرات اظہار
اس دور میں بندے لب اظہار کو ترسیں
چار سُو توحید کے انوار پھیلانا ہے نعت
شرک کے سب بُت گرا دینا بھی اُن ﷺ کی نعت ہے
دل کو رکھنا حُبِّ دنیا سے ہمیشہ بے نیاز
فکر عقبیٰ کی سدا کرنا بھی ان کی نعت ہے
بخش دینا سنگ باری کرنے والوں کو ہے نعت
اپنے اعدا کو دعا دینا بھی اُن ﷺ کی نعت ہے
صبر ہے اُن ﷺ کی ردا تو ذکرِ اللہ ہے انیس
ہے محبت ہی اساسِ دین و سیرت آپ ﷺ کی
خُلق ہے اُن ﷺ کا جہاد اس کارزارِ زیست میں
اور ہے پہچان خالق کی اطاعت آپ ﷺ کی

مدینہ منورہ نذیر اختر کی نعت کا ایک اہم موضوع ہے۔وہاں کا ماحول، فضائیں، آثار، پھل دیگر متناسبات ان کے لئے نعت خیز اور ثنا انگیز جذبات و احساسات کا مصدر ہیں۔اس شہر خنک کی یادیں ان کی نعت کے لئے مبارک مہمیز اور بابرکت محرکات کا درجہ رکھتی ہیں۔ان کے یہ اشعار دیکھئے:

اے عُود نگر، رشکِ ارم، شہرِ مدینہ
فردوس کی خوشبو ہو ترے نام کے صدقے
اُڑ جاؤں میں خوشبو کی طرح سُوئے مدینہ
ہو جاؤں میں طیبہ کے در و بام کے صدقے
سرکار ﷺ کے قدمین میں اک شام جو گزرے
تا عمر ہوں جس میں مری اس شام کے صدقے
طیبہ کا ہر اک کوچہ ہے فردوسِ معطر
اس جنّتِ ارضی کے در و بام کے صدقے
ملے واں بھی زم زم کی نعمت بکثرت
ہیں عجوہ و عنبر عطائیں وہاں کی
بھلی واں پہ لگتی ہیں سورج کی کرنیں
عجب ہیں چنیدہ شعاعیں وہاں کی

شاعرانہ جمالیات سے معجزاتِ رسول کا بیاں بھی نذیر اختر کی نعت گوئی کا اہم پہلو ہے۔ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے عود نگر کی نعتوں میں متفرق جگہوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے بیان کے علاوہ ایک ہی نعت میں تسلسل کے ساتھ ان کا اظہار، گویا غزل کی عمومی فکری ریزہ کاری کی بجائے، غزلِ مسلسل کی ہیئت کی طرح نعت میں کئی معجزات بیان کر دیئے ہیں۔ان کی یہ نعت دیکھئے:

دِل سے جو آشنا ہے خدا کی کتاب کا
قائل ہے معجزاتِ رسالت مآب ﷺ کا
تھی زندگی حضور ﷺ کی پُر معجزات سے
لا فخر کہنا عجز تھا عالی جناب ﷺ کا
کفار اس کو کہتے رہے سحرِ مُستمِر
شقُّ القمر بھی معجزہ ہے آنجناب ﷺ کا
پہنچے بہ جسمِ پاک نبی ﷺ عرشِ پاک پر
معراج واقعہ نہیں حضرت ﷺ کے خواب کا
آیہ مَا رَمَیتَ میں رب نے بیاں کیا
اِک معجزہ جنابِ رسالت مآب ﷺ کا
پاتا حضور ﷺ سے ہے ولایت ہر اک ولی
فیضان بٹ رہا ہے رسالت مآب ﷺ کا

الفاظ کے استعمال میں نذیر اختر نے کہیں کہیں نادرہ کاری کا مظاہرہ کیا اور مشکل زمینوں میں نسبتاً کم استعمال ہونے والے قوافی تلاش کئے ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل دو اشعار سے ظاہر ہے:

ہجر طیبہ میں جو دیکھو مثلِ برگِ زرد ہوں
قُربِ طیبہ پاؤں تو پھر میں مہکتا ورد ہوں
ہجر طیبہ میں لگیں موسم خزاں آمیز سب
قربِ طیبہ میں مگر پاتا بہارِ بَرد ہوں

شاعر نے اس زمین میں ورد کے ساتھ برد کا قافیہ استعمال کیا ہے۔برد کا قافیہ میرے محدود مطالعے کے مطابق اردو نعت میں پہلی بار استعمال ہوا ہے۔برد کے معنی سرد و خنک کرنے یا بہ برف آمیختن چیزے را کے علاوہ۔خواب کردن۔ ہمیشہ بودن اور قیام نمودن کے بھی ہیں۔ہجر طیبہ، موسم خزاں آمیز کے بعد اس شعر کے دوسرے مصرعے میں قربِ طیبہ کے بہارِ برد کی ترکیب کے استعمال نیز ہجر کے ساتھ قرب، خزاں آمیز موسم کے ساتھ جاودانی بہار، سے جو معنوی تلازمات پیدا ہوتے ہیں انہوں نے ایک خوبصورت تصویر پینٹ کر دی ہے۔

عود نگر میں ایسے images (صورتیں ۔عکس ۔تشبیہات)اور کئی تمثیلیں موجود ہیں جن میں نعتیہ مضامین و موضوعات کی عکاسی تصویروں اور امیجز کے ذریعے ہوئی ہے ان امیجز، تماثیل اور محرکات سے ان اشعار کے نعتیہ محسوسات و مشاہدات کی ترجمانی زیادہ موثر ہو گئی ہے۔

عود نگر کا مطالعہ ادھورا رہے گا اگر میاں نذیر اختر کی اس حوالہ جاتی محنت کی نشاندہی نہ کی جائے جو انہوں نے اس کتاب کی ترتیب میں روا رکھی ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ قرآن کریم اور احادیث رسول اکرم A کے حوالوں سے اپنے نعتیہ اشعار کی توثیق و تصدیق کی ہے۔ان کا حوالہ جاتی اسلوب سکالرز کا سا ہے۔انہوں نے اپنے شعر میں جہاں کہیں قرآن کریم کا کوئی مضمون لیا یا کسی حدیث رسول اکرم A سے کوئی مفہوم اخذ کیا۔حاشیے میں اس کا حوالہ مع ترجمہ دے

دیا ہے۔ یہ کام محنت اور محبت کا ہے جس سے انہوں نے عودنگر کی شروع سے آخر تک تزئین کی ہے۔ نعت کی کتابوں میں ایسا التزام اور اہتمام کم کم ملتا ہے۔ اردو نعت کے معروف شاعروں عبدالعزیز خالد اور ع س مسلم کی بعض کتابوں میں ایسا حوالہ جاتی نظام نظر آتا ہے۔ ہمارے سیرت نگار تو ایسا اہتمام کرتے ہیں، نعت نگار نہیں۔

بہ حیثیت مجموعی عودنگر اپنے موضوعات اور پیشکش کے اعتبار سے عام نعتیہ شاعروں سے مختلف اور منفرد مجموعہ ہے اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک سے عقیدت و محبت، ارادت و وابستگی اور فدویت و شیفتگی کا جو اظہار ہُوا ہے وہ متاثر کن اور لائقِ تحسین ہے۔ عودنگر کے مطالعے میں قاری میاں نذیر اختر کے اخلاص اور انجذاب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ عودنگر کے نام سے ہی اس مجموعہ نعت کی انفرادیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ پھر موئے مبارک ردِّ قادنیت اور عقیدہ ختم نبوت سے متعلقہ اشعار کا اظہار رسمی نہیں دلی اور فطری ہے۔ میاں نذیر اختر اس موضوع کے ساتھ جبلّی اور اعتقادی طور پر منسلک ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، ان کی نعت حبِ اطاعت نژاد کے جذبے سے پھوٹی ہے اور اسی سبب اپنے اندر کشش، اخلاص اور تاثیر رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں اپنی حمد اور نعتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں توفیقات مزید سے نوازے (آمین)۔ مَیں عودنگر کے بارے میں اپنے تاثرات اس رباعی پر ختم کرتا ہوں:

گُل دستہ فیضِ شاہِ کوثر کا
حمدِ باری و نعتِ سرور کا
ہے جاذب و پُراثر مجموعہ
عود نگر میاں نذیر اختر کا

عود پر تحقیقی نوٹ

عود، مہندی کے پودے کی طرح چھوٹے قد کا درخت ہے جس کی لکڑی اور روغن کے بہت سے فوائد ہیں۔ یہ پودا عطریات اور خوشبویات کے لئے مشہور ہے۔ یہ خوشبودار لکڑی جسے بطور بخور جلایا جاتا ہے اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ سفید، سیاہ، زرد اور ذمہ داری ___ عمدہ قسم کا عود پانی میں ڈوب جاتا ہے اس لئے اسے عود غرقی بھی کہتے ہیں۔

ہم اگر عود کی تفصیل میں جائیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ خوشبو کی سینکڑوں قسموں میں یہ منفرد خوشبو ہے ہمارے ہاں مغربی پرفیومز، کے علاوہ مشک، عنبر، ند، لادن، گلاب، کافور، صندل وغیرہ کی جو بہت سی شکلیں ملتی ہیں ان میں عود، عنبر اور صندل کو ملا کر بھی ایک مرکب عطر تیار کیا جاتا ہے جسے عطر مثلث کہتے ہیں اس طرح عطر ساز مختلف عطریات کی آمیزش اور مرکبات سے اس کی مختلف تشکیلات (Formations)) تیار کرتے ہیں۔

عود(Aloes.Wood)) سے عود افروز، عودا لاحمر، عودالبرق، عودالحمد، عودالخیر، عودالدرفہ، عودالریح، عودالصلیب، عودالعطاس، عودالفرج، عو دللبان، عود ساز، عودسیمیں، عودقرمز، عودگلابی، عودمثلث، عودنواز جیسی کئی لفظی ترکیبات اور خوشبوئی مرکبات بنتے ہیں۔ عود کے درخت کی قہوہ رنگ لکڑی جسے جلانے سے خوشبو پیدا ہوتی ہے (علاج کے علاوہ اسے عطریات سازی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے)۔ عود کی خوشبو سونگھتے ہی سب سے پہلے حجرِ اسود اور غلافِ کعبہ کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ عود کے معنوی تلازمات کا ایک رُخ اس خوشبو کے ظاہری اور معلوم اوصاف سے ہٹ کر اس کے باطنی اور نسبتاً کم معلوم اہمیت اور انفرادیت کے ساتھ ملا ہُوا ہے صوفیائے کرام خصوصاً حقائق جُو اور راز یاب صوفیا کے نزدیک عود محض ایک خوشبو نہیں اس سے بڑھ کر قدرت کا ایک ایسا مظہر (Phenomenon)) ہے۔ جو اپنے اندر دلپذیری جذب اور حیرت کا ایک جہان رکھتا ہے باطنی مشاہدات کی دنیا ظاہری موجودات سے مختلف ہوتی ہے لہٰذا اس مظہر کے بارے میں ملنے والی معلومات کی تصدیق و توثیق مشکل ہے لیکن ایک راز یاب صوفی منش خوشبو شناس (جو ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں) نے بتایا کہ یہ ”عود“ جنت کی خوشبو ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اسے جنت سے لائے تھے اور انہوں نے اسے یہاں اگایا تھا۔

یہ خوشبو نایاب ہے۔

یہ(عود) درخت کی لکڑی کا تیل ہوتا ہے۔

یہ خوشبو قدرتی اور سب سے الگ صفات کی مالک ہے۔

یہ خوشبو ہَوا میں جتنی اڑتی ہے اس سے زیادہ جسم میں جذب ہوتی ہے۔

یہ خوشبو فضا کو متاثر کرتی ہے اور آدمی کی الگ پہچان بناتی ہے اور اس کی شخصیت کو اُبھارتی ہے۔

اس سے ناپاک چیزیں دُور بھاگتی ہیں اور نیک چیزیں قریب آتی ہیں۔

یہ دل، دماغ، روح اور جسم میں توازن پیدا کرتی اور اسے برقرار رکھتی ہے اور (خیر کی) طاقتوں کو تیز کرتی ہے۔ (یعنی انسان کو راست رَو اور خیر جُو بناتی ہے) شخصیت کے پیچیدہ جوہر کو کھولتی ہے۔ یہ شخصیت کے مطابق اپنی خوشبو کے اثرات چھوڑتی ہے یعنی بے جان ہوتے ہوئے محض مردم شناس ہی نہیں یہ خوشبو اس کے شخصی جوہر کا بھی ادراک رکھتی ہے۔ یعنی عود استعمال

کرنے والا اپنے شخصی جوہر اور صلاحیت کے مطابق ہی اس سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔

یہ میلوں کا سفر طے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے یعنی بعض اوقات اس کا تصور ایک باصلاحیت انسان اس کے اثرات سے فیض حاصل کرسکتا ہے۔ بقول حافظ لدھیانوی:

بند کی آنکھ، حرم جا پہنچے
یہ نئی راہ نکالی ہم نے

یعنی عود شناس محض اس کے تصور سے اس کی کیفیت اور خوشبو سے محظوظ ہوسکتا ہے۔

یہ انسانوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

عود تنہائی کا مزہ دوبالا کرتا ہے اس کے استعمال سے خلوت سکینت خیز ہوسکتی ہے۔

یہ واحد خوشبو ہے جو آدمی کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔

یہ خوشبو تیمارداری میں شفا کا کام کرتی۔

کسی بھی محفل میں لگانے والے کی شخصیت اور حیثیت کو فراموش نہیں ہونے دیتی۔

اس سے وابستہ ایک حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ اس کے لگانے والے کا ذکر اچھے الفاظ سے ہوگا۔

عود کی خوشبو استعمال کرنے والے کی خوداعتمادی میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔

یہ سب سے خوبصورت صدقہ جاریہ ہے جس سے پوری محفل لطف اندوز ہوتی ہے۔

یہ خوشبو ایک ایسی باطنی قوت (Energy) کی حامل ہے جو لگانے والے کی (Tuning) کرتی رہتی ہے۔

یہ خوشبو روح اور خیال پر یکساں طور پر خوشگوار اثرات ڈالتی ہے۔ احساس محرومی کے خاتمے کا باعث ہوتی ہے۔ انسان کی روحانی بالیدگی (Trans) کا سبب بنتی ہے۔

عود کی خوشبو سے وابستہ ساری بھلائیاں، ساری برکتیں اور ساری خوبیاں آپ ﷺ کا فیض ہیں۔

آپ ﷺ نے جس چیز کو چھوا، استعمال کیا وہ لازوال صفات اور خوشبو کی حامل ہوگئی۔

اب اس بات کو اس حدیث رسول اکرم صل اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں زیرِ غور لائیے جس میں نماز اور عورت (بیوی) کے ساتھ خوشبو کو آپ کے لیے پسندیدہ بنائے جانے کا ذکر ہے۔ واضح رہے کہ حدیث میں یہ تینوں چیزیں آپ کی پسندیدہ کی بجائے آپ کے لئے پسندیدہ بنا دی گئی ہیں کے مفہوم میں ہے گویا خوشبو کو آپ کی ذات والا تبار اور شخصیت گرامی قدر کے لئے اسی طور پر پسندیدہ بنا دیا گیا یعنی آپ کی طبیعت، سرشت اور مزاج کا ناگزیر حصہ بنا دیا گیا ہے۔

آپ نے عود کو پسند فرما کر اس پر احسان کیا اور اس کو اپنی پسندیدگی سے مشرف فرما کر اپنی جلوت و خلوت کی فضا میں داخل ہونے کی اجازت عطا فرمائی اور اسے اپنی امت کے لئے بھی پسند فرمایا۔ عود کی تعریف اور اثرات پر اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے (یہاں خوشبو شناس پروفیسر کی بات ختم ہوجاتی ہے)۔

یہ مسئلہ جداگانہ طور پر تفصیل طلب ہے کہ اس کے استعمال کے طریقے، اوقات، آداب کیا ہیں؟ اور اس سے متعلق کئی ناگزیر مسائل ہیں جن کا جاننا بقدر مزاج و طبع اور صلاحیت و استعداد ہر طالب عود اور استعمال کرنے والے کے لیے ضروری ہے۔ بہت سے لوگ عود استعمال کرتے ہیں مگر اس کے باطنی اثرات، صفات کے واقف نہیں ہوتے بقول مولانا روم

تو در ایں مستعملی نی عاملی
زانکہ محمول منی نی حاملی

یعنی اس بارے میں تو مستعمل ہے مگر عامل نہیں محمول ہے مگر حامل نہیں۔ اس شعر کا علامتی اور استعاراتی مفہوم بہت وسیع ہے اور زندگی کے کئی شعبوں پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

(مضمون مشمولہ کتاب ''عودنگر'')

ادب کا چراغ، روایت کا امین یہ رسالہ حضرت مولانا حامد علی خاں رحمہ اللہ کی یادگار کے طور پر شائع کیا جاتا ہے۔
لاہور کا معروف ادبی رسالہ جو برسوں سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔
ادب نواز شخصیت شاہد علی خاں کی زیرادارت
شاعری، افسانہ، تنقید، تحقیق، تراجم، محفلِ احباب، خصوصی گوشے، ہر شمارہ ایک نیا زاویہ، ایک نئی خوشبو
اگر آپ ادب سے محبت رکھتے ہیں یا خود کو قلم سے جوڑنا چاہتے ہیں تو ماہنامہ ''الحمرا'' میں آپ کا پرخلوص خیر مقدم ہے!
اپنی تخلیقات ارسال کریں اور اردو ادب کے اس قافلے کا حصہ بنیں
J-24 ماڈل ٹاؤن لاہور، 0333-4001844

ماہنامہ لاہور
الحمرا
بہ یادِ حضرت مولانا حامد علی خاں

ابوعبداللہ جعفر رودکی کے، جن کو فارسی شاعری کا باوا آدم خیال کیا جاتا ہے، بارے میں کتابوں میں آیا ہے کہ وہ بصارت سے محروم تھے لیکن اپنے زورِ تخیل اور طرزِ بیان سے لوگوں کے دلوں پر ایسا سحر طاری کر دیا کرتے تھے کہ باید و شاید۔ روایت ہے کہ امیر ابونصر سامانی نے بوجوہ ہرات میں اپنے لاؤ لشکر سمیت پڑاؤ ڈالے جب ایک طویل مدت گزر گئی تو امرا، وزرا میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ امیر ابونصر سامانی کو یہ کہے کہ انھیں اپنے اہل و عیال سے جدا ہوئے ایک عرصہ بیت گیا ہے اور اب انھیں بخارا کا رخ کرنا چاہیے۔ آخر طے پایا کہ یہ مسئلہ رودکی کے سامنے رکھا جائے۔ رودکی نے حسبِ حال بائیس اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ لکھا، جس کا مطلع ہے:

بوئے جوئے مولیاں آید ہمے
یادِ یارِ مہرباں آید ہمے

امیر ابونصر سامانی نے قصیدہ سنتے ہی اپنے موزے پہنے اور زین کے بغیر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور حکم دیا: چلوفی الفور

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ابوالعلا معری کا، جو ایک عرب شاعر تھے اور جو اوائل عمری ہی میں نابینا ہو گئے تھے، حوالے سے معروف ہے کہ ان کا کلام اتنا دل پذیر تھا کہ جو بھی سنتا، سر دھنتا رہ جاتا تھا۔ علامہ اقبال بھی ابوالعلا معری سے حد درجہ متاثر تھے۔ بالِ جبریل میں ابوالعلا معری کے عنوان سے ایک نظم، جس کا یہ آخری شعر، جو ابوالعلا معری کا تخیل ہے، زبان زد خاص و عام ہے:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

سنا ہے کہ قلندر بخش جرأت، جان ملٹن اور قدیم یونانی شاعر ہومر بھی بصارت سے محروم تھے مگر وہ اپنی شاعری سے سامعین و قارئین کو اس درجہ مسحور کر دیتے تھے کہ وہ اش اش کرتے رہ جاتے۔

اگر آپ تعلّی پر محمول نہ کریں تو میں اس زمرے میں تیمور حسن تیمور کو شامل کرتا ہوں۔ اگرچہ تیمور حسن کا ہمارے معاشرے میں وہ چرچا نہیں ہوا جتنا متذکرہ شاعروں کا ہوا، شاید اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تیمور حسن نے اپنی عمرِ طبعی بھی پوری نہیں کی اور وہ اکاون سال ہی کی عمر میں ۲۲ جولائی ۲۰۲۵ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے، اگر وہ بھی تیس سال کی عمر اور پاتے جیسا کہ یہ پاکستان کے لوگوں کی اوسط عمر ہے اور ان کی پروازِ تخیل کا یہی عالم رہتا تو یقیناً اُن کا بھی اسی قبیل کے شاعروں میں شمار ہوتا۔ میں یہ بات بڑے وثوق سے کہ سکتا ہوں کہ تیمور حسن تیمور گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ، لاہور میں، جہاں میں نے طلبہ کو کم و بیش پچیس سال تک اُردو زبان و ادب کی تعلیم دی، دو سال تک (ء تاء) میرے شاگرد رہے تھے۔ اس عرصے میں انھوں نے مجھ سے انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو اعلیٰ کا مضمون پڑھا تھا۔ میں اس عرصے میں ان سے بے حد متاثر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرا تیمور حسن کی کلاس کو، جو پندرہ سولہ طلبہ پر مشتمل بڑی مستعد کلاس تھی۔ میرا پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ میں اس کلاس کو پڑھانے کے لیے روزانہ ہی تیاری کر کے آتا اور بڑا زور لگا کے پڑھاتا تھا۔ ہر لیکچر کے دوران تیمور کا یہ حال ہوتا کہ جب میں کسی شعر کی تشریح کرتا تو تیمور مجھے اس شعر کے متعلق کسی دیگر شاعر کا شعر سناتا جس سے شعر کی تشریح کا مزہ دوبالا ہو جاتا اور میں اسے ہر موقع پر شاباش دیتا۔

تجربہ شاہد ہے کہ ایسے مواقع پر اس طرح دخل دینے سے اکثر استاد برا مانتے ہیں لیکن میرا حال اس سے قطعاً مختلف تھا اور میرے سامنے اس کا مثبت پہلو تھا کہ میری معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔ اردو اعلیٰ کی اس کلاس کے حوالے سے میری یہ کیفیت تھی کہ میں یہ کلاس کبھی نہ چھوڑتا تھا اور سخت سردیوں کے دنوں میں تو جب کلاس روم میں سردی کے مارے دانت بجتے تھے، کلاس کو لے کر کالج کنٹین کے قریب گراؤنڈ میں دھوپ میں آ جاتا تھا۔

مجھے میرا یہ شاگرد اچھا لگتا تھا کیوں کہ میں اس کی ذہانت و فطانت اور یادداشت سے بہت متاثر تھا۔ ایک دن میں نے اس صورت حال کا ذکر اپنے قریبی دوست اور رفیق کار پروفیسر جعفر بلوچ سے، جو ایک منجھے ہوئے شاعر تھے اور کالج میگزین دبستان کی، جس کا میں مدیر اعلیٰ تھا، اشاعت میں میرا ہاتھ بٹاتے تھے، کیا۔ انھوں نے چھوٹتے ہی کہا: مجھ سے ملواؤ تو پتا چلے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ عین اسی وقت جب ہم تیمور کی باتیں کر رہے تھے، تیمور کا ہمارے پاس سے گزر ہوا اور میں نے اُسے پروفیسر جعفر بلوچ سے ملوایا۔ کہتے ہیں کہ ایک ماہر باورچی دیگ میں سے چاولوں کے چند دانے ہتھیلی پر رکھ کر پوری دیگ کا مزاج بتا دیتا ہے، بعینہٖ پروفیسر جعفر بلوچ نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

انھوں نے تیمور سے مخاطب ہو کر کہا: اپنی طبع کو مہمیز کرو اور مجھے ملتے رہا کرو۔ گویا اُسی دن سے پروفیسر جعفر بلوچ نے تیمور حسن کو اپنی باقاعدہ شاگردی میں لے لیا۔

ان دنوں میری پروفیسر جعفر بلوچ سے، جن کا خاکہ میری خاکوں پر مبنی پہلی تصنیف : اب انھیں

ڈھونڈھ میں موجود ہے، بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا اور وہ میرے ساتھ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی بارھویں جماعت کے لیے اُردو لازمی کی کتاب سرمایہ اردو کے شریک مصنف تھے اور یہ تعلق ان کے دم واپسیں تک برقرار رہا۔ کالج اوقات میں ہمارا یہ حال تھا کہ انھیں کبھی واش روم جانے کی حاجت ہوتی تو مجھے کہتے " : آئیں، بابِ شاشیدن وا کرنے چلیں۔ اور میں اُسی وقت ان کے ساتھ، چہ جائے کہ مجھے حاجت نہ بھی ہوتی، چل پڑتا۔ ایک دن ہم دونوں واش روم کی جانب جارہے تھے کہ راستے میں تیمور حسن سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ مجھے کیا سوجھی کہ میں نے اس کی پشت کی جانب سے اپنے ہاتھ اُس کی دونوں آنکھوں پر ایسے رکھ دیے جیسے بے تکلف دوست آپس میں کیا کرتے ہیں اور اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ : بوجھو تو جانیں۔ تیمور حسن نے اس وقت میرے ہاتھ پکڑ لیے اور انھیں ایک دو بار ٹٹولا اور کہا:

یہ کوئی لڑکا نہیں، ادھیڑ عمر شخص ہے، آپ آج اپنا نام بتا دیں، آئندہ جب بھی آپ ایسا کریں گے، میں آپ کو پہچان لوں گا۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے کئی بار چپکے چپکے پیچھے سے اگر تیمور حسن کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا تو اس نے میرا ہاتھ ٹٹول کر فوراً بتا دیا کہ:

زہے نصیب، آپ ڈاکٹر علی محمد خاں ہیں۔

انھی دنوں کا اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ بھی ضابطہ تحریر میں آنا چاہیے۔ ہوا یوں کہ میں ایک بار بڑا علیل ہوگیا اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ مجھے شیخ زاید ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ تیمور حسن کو خبر ہوئی تو وہ میری عیادت کے لیے اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر ہسپتال آ گیا۔ میں وارڈ میں داخل تھا اور میری بیوی بستر کے ساتھ کرسی پر بیٹھی تھی۔ میرے کانوں میں تیمور کی آواز آئی:

مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے استاد اس وارڈ میں ہیں۔

میں نے اپنی بیوی کو، جو تیمور کو جانتی تھی، کہا کہ یہ تیمور حسن ہے، اسے بلالیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تیمور حسن ایسے ان دیکھے اور ان کہے جو اس کا بھی مالک تھا جن کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔

برسبیل تذکرہ ایک اور واقعہ بھی سن لیں۔ مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ جن دنوں تیمور حسن وحدت روڈ سائنس کالج میں پڑھتا تھا تو اس کی والدہ ماجدہ کا، جو تیمور حسن کا ملجا و ماوی تھیں، ناگہانی طور پر انتقال ہوگیا تو تیمور حسن اس صدمے سے یہاں تک متاثر ہوا کہ اس نے اپنی پڑھائی ترک کرنے کا فیصلہ کرلیا اور کالج آنا جانا چھوڑ دیا۔ جب اس سانحے کو ہفتہ عشرہ گزر گیا اور اس واقعے کی خبر پروفیسر جعفر بلوچ کو ملی تو وہ مجھ سے کہنے لگے:

مجھے تیمور کے ایک دوست نے بتایا ہے کہ تیمور نے اپنی پڑھائی چھوڑ دی ہے اور کالج میں آنا جانا ترک کر دیا ہے۔ آئیں ہم دونوں تیمور حسن کے گھر کلفٹن کالونی چلتے ہیں اور اُسے سمجھاتے ہیں۔ امید ہے وہ ہماری بات مان جائے گا۔

چناں چہ ہم دونوں پوچھتے پچھاتے تیمور کے گھر پہنچے۔ وہ ہمیں مل کر بلک بلک کر رونے لگا۔ ہم نے اُس کی ڈھارس بندھائی اور اسے سمجھایا بجھایا، یہاں تک کہ اُس نے اگلے ہی دن سے دوبارہ کالج آنے کا وعدہ کرلیا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس دنیا میں بعضے لوگ ایک دوسرے کے غم گسار ہوتے ہیں لیکن پروفیسر جعفر بلوچ جیسا غم گسار آپ کو شاید ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔

انھی دنوں کا ایک اور واقعہ بھی سن لیں۔ ہوا یوں کہ برسات کے موسم میں ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ تیمور کو نامعلوم کیا سوجھی کہ اس نے ہمارے گھر کنج عافیت کا رخ کیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُسے اندر آنے کو کہا۔ اس نے پاؤں میں تسمے والے بوٹ پہن رکھے تھے۔ وہ اندر آیا تو آتے ہی کہنے لگا : مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں نے آپ کا قالین خراب کر دیا ہے۔ میں نے اُسے تشفی دی کہ کوئی بات نہیں، قالین زیادہ خراب نہیں ہوا۔ مگر میں حیران تھا کہ اسے نظر تو آتا نہیں، پھر اسے کیسے معلوم ہوا کہ قالین خراب ہو گیا ہے۔

میں گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور سے ستمبر ء کو ریٹائر ہوا تھا۔ مجھے ریٹائر ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ پنجاب پبلک سروس کمیشن نے مجھے اُردو لیکچرر کا پرچہ مرتب کرنے اور جانچنے کا کام تفویض کر دیا۔ میں نے اس امر کی خبر افشا کیے بغیر تیمور حسن کو، جو اردو لیکچررشپ کا امیدوار تھا، تاکید کی کہ وہ اپنی جوابی کاپی کی پیشانی پر ممتحن کی توجہ کے لیے سرخ روشنائی سے Blind Candidate لکھ دے اور اپنا Writer اپنے ساتھ خود لے کر جائے مگر وہ Writer ایسا ہونا چاہیے جس کی کوالیفیکیشن بی اے سے زیادہ نہ ہو اور ایک تو اس کا لکھا بخوبی پڑھا جائے دوسرے وہ املا و انشا اور ہجوں کی غلطیاں نہ کرتا ہو۔ تیمور نے میرے کہنے پر صاد کیا مگر اسے Writer ایسا ملا جس میں پانچوں شرعی عیب موجود تھے۔ میں نے پرچہ دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ تیمور نے تو جوابات بالکل درست لکھوائے تھے مگر Writer نے غلط لکھا ہے، چناں چہ تیمور نے بہت اچھے نمبر حاصل کیے اور اگرچہ تیمور حسن Disable کی سیٹ کا بھی حق دار تھا تاہم وہ اوپن میرٹ پر ہی منتخب ہو گیا۔ تیمور کی سرکاری ملازمت کا آغاز ستمبر ء سے ہوا اور اس نے پہلے پہل گورنمنٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں پڑھانا شروع کیا جہاں وہ بیشتر روزانہ ہی لاہور سے کبھی سفید چھڑی لے کر اور کبھی بغیر چھڑی لے کر توکل کے

سہارے جاتا اور کہیں شام کو لوٹتا۔ سردی ہو یا گرمی، آندھی ہو یا طوفان، اُس نے کبھی چھٹی نہ کی تھی۔ انھی دنوں ایک دن میرا لاہور سیکرٹریٹ میں، ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں، جہاں کے ایک ڈپٹی سیکرٹری میرے شاگرد تھے، جانا ہوا۔ میں نے ان سے تیمور حسن کا ذکر کیا اور انھیں بتایا کہ تیمور حسن نابینا ہے مگر اسے روزانہ اپنے فرضِ منصبی کی بجا آوری کے لیے گوجرانوالہ جانا پڑتا ہے، کیا اس کا تبادلہ لاہور کے کسی کالج میں نہیں ہو سکتا؟ انھوں نے کہا کہ ہر چند تبادلوں پر پابندی عائد ہے مگر میں کسی نہ کسی طرح تبادلے کی گنجائش نکالوں گا۔ میرے کہنے کا اثر تھا یا شاید کچھ اور بہانہ بنا تھا کہ تیمور حسن کا تبادلہ دو سال تک دھکے کھانے کے بعد ء میں گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ میں اور وہاں سے ء میں گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ میں ہو گیا، جہاں انھیں اپنے مربی و محسن عطاء الحق قاسمی کی سفارش پر سرکاری رہائش بھی میسر آ گئی اور زندگی قدرے ڈھنگ سے گزرنے لگی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تیمور حسن کے ایک اور وصف کا، جس کے بارے میں زیادہ لوگ نہیں جانتے، ذکر کر دیا جائے۔ وہ یہ کہ تیمور حسن کرکٹ کے بھی بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ قارئین کو حیرت ہوگی کہ جو شخص بصارت سے محروم ہو وہ ایک اچھا کھلاڑی کیسے بن سکتا ہے، مگر حقیقت یہی ہے۔ نابینا لوگوں کی کرکٹ جدا گانہ ہوتی ہے۔ اُن کی گیند ذرا بڑی اور اس میں گھنگرو ہوتے ہیں اور وہ آواز کے تعاقب کے زور پر ہٹ لگاتے ہیں اور آواز ہی کے تعاقب میں ان کی فیلڈنگ ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ میرا خیال ہے کہ تیمور حسن کی قوت سماعت دوسرے نابیناؤں کی نسبت کہیں زیادہ تھی اور وہ آواز پر اس طرح لپکتا تھا جیسے چیتا اپنے شکار پر لپکتا ہے اور بیچ کے اوپر ایسی جھاڑو پھیرتا تھا کہ زوردار ہٹ ضرور لگتی تھی۔ تیمور حسن نے مجھے خود بتایا تھا کہ اس نے لاہور اور کراچی میں بڑے بچ کھیلے اور ہر میچ جیتا۔ وہ انڈیا جانے والی ٹیم میں بھی سیلیکٹ ہو گیا تھا مگر اسے ویزہ نہ مل سکا تھا اور وہ انڈیا نہ جا سکا تھا۔ بہرکیف اس کا اصل رجحان، جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، پڑھنے پڑھانے اور شعر و شاعری کی طرف تھا اس لیے اس نے جلد ہی کرکٹ کو خیرباد کہہ دیا۔

اس موقع پر مجھے تیمور حسن کی شادی کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جب میری شادی طے پا گئی تو میں نے خواہش ظاہر کی کہ جس کے ساتھ میری شادی ہو رہی ہے، میں ایک لمحے کے لیے اس کے ساتھ ملنے کا آرزومند ہوں اور کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ چناں چہ مجھے موقع فراہم کیا گیا تو میں نے اپنی ہونے والی بیوی سے پوچھا: بھلی مانس! کیا تمھاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ میں تو نابینا ہوں۔ تم میرے پلے بندھ گئی تو تمھیں ساری عمر ایک نابینا سے نباہ کرنا ہوگا۔ تمھارے پاس ابھی موقع ہے کہ انکار کر دو، مجھے قطعاً کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہ ہوگا۔

اس بھلی مانس نے یہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا کہ شادی کے بعد بھی تو کسی عورت کا خاوند نابینا یا اپاہج ہو سکتا ہے۔ میں نے پختہ عزم کیا ہے کہ ساری عمر آپ کی خدمت کروں گی اور خدمت شعاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گی۔ اسی طرح ہمارے مابین جو معاہدہ اُس دن طے پایا تھا وہ عمر بھر استوار رہا۔

مجھے یاد ہے کہ تیمور حسن کی شادی تو مانسہرہ میں ہوئی تھی اور رخصتی بھی وہیں سے ہو گئی تھی اور میں بوجوہ اس میں شریک نہ ہو سکا تھا مگر ولیمے کی تقریب گلشن راوی کے ایک شادی ہال کے فسٹ فلور پر ہوئی تھی۔ اس موقع پر تیمور حسن ہمارے گھر آیا اور اس نے مجھے کہا کہ سر! کل میرے ولیمے کی تقریب ہے، آپ مجھے یہ عزت بخشیں کہ گلشن راوی شادی ہال سے ہم میاں بیوی کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر کلفٹن کالونی میں ہمارے گھر چھوڑ کر آئیں اور میں نے تیمور حسن سے وعدہ کر لیا کہ میں ضرور بالضرور آؤں گا۔

مجھے گلشن راوی جانے میں کسی قدر تاخیر ہو گئی تو میں نے سنا کہ جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو تیمور حسن نے وہاں شور مچا دیا کہ میرے سر ڈاکٹر علی محمد خاں کو بلاؤ۔ اتنے میں میں پہنچ گیا، چند نوالے لیے اور تیمور حسن اور اس کی بیوی کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور انھیں گلیوں کے پیچ و خم طے کرتا ہوا، ان کو ان کے گھر کلفٹن کالونی چھوڑا۔ جب وہ گاڑی سے نیچے اُتر رہے تھے تو میں نے اس وقت شرارت آمیز لہجے میں ذرا تصرف کے ساتھ یہ شعر پڑھا:

سپردم بہ را تو مایۂ خویش را
من نہ دانم حسابِ کم و بیش را

میرے پاس تیمور حسن کی بے شمار باتیں ہیں اور ان کی ہر بات دل موہ لینے والی بات ہے۔ ورطۂ حیرت میں ہوں کہ اس کی کس کس بات کا ذکر کروں اور کس کس بات کو قلم انداز کروں۔ بعض قارئین کے شاید علم میں ہوگا کہ تیمور حسن پنجاب یونیورسٹی کا وہ پہلا نابینا شخص تھا، جس نے ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی اور وہ ڈاکٹر تیمور حسن بن گیا تھا مگر اس نے تحقیقی فضا سے نکلتے ہی دوبارہ میدان شعریت میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے۔

سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ ہر شخص کو دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ بقول مرزا شوق لکھنوی:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ہاں البتہ کچھ لوگ جلد رخصت ہو جانے میں عافیت سمجھتے ہیں اور کچھ دیر لگا دیتے ہیں۔ تیمور حسن کو ذرا جلدی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ میرے بعد میرے تینوں سعادت مند بچوں اور میری

وفا شعار بیوی کا کیا حال ہوگا اور وہ میری جدائی کا صدمہ برداشت بھی کر سکیں گے یا نہیں۔

تیمور حسن کا جنازہ ۲۲ جولائی ۲۰۲۵ء کو ہوا۔ وہ میرا قابلِ فخر شاگرد تھا اور مجھے اس کی تکفین و تدفین میں اگلے دن شریک ہونا چاہیے تھا لیکن میں اس لیے شریک نہ ہو سکا کہ میں سڈنی (آسٹریلیا) گیا ہوا تھا۔ شعبہ اُردو کے صدر شعبہ ڈاکٹر نعیم بزمی اور تیمور حسن کے ہم سائے پروفیسر رانا محمد یوسف کے ساتھ فون پر بات ہوئی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ سائنس کالج کی فٹ بال گراؤنڈ' میں تیمور حسن کا جنازہ پڑھا گیا جو اُن کے بڑے صاحب زادے ارمغان تیمور نے پڑھایا تھا اور پوری گراؤنڈ لوگوں سے بھری ہوئی تھی اور رضا بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

اس موقع پر مجھے تیمور حسن کی شاعری کا ذکر کرنا چاہیے کیوں کہ وہ ایک منفرد شاعر تھا کہ مشاعرہ لوٹ لیتا تھا لیکن چوں کہ میں خود شعر نہیں کہتا اس لیے شاید اس کی شاعری کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں۔۔ بہر کیف چاہے سرسری بیان سہی ذکر ضرور کروں گا۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تیمور حسن سائنس کالج میں پڑھتا تھا اور میرا بھی شاگرد تھا۔ میں نے جب اس کی شاعری دیکھی اور مجھے اچھا لگا تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی شاعری عام کرنے سے پہلے پروفیسر جعفر بلوچ کو ضرور دکھا لیا کرے، چناں چہ اس نے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے، پروفیسر جعفر بلوچ کو اپنا استاد گردانتے ہوئے اپنا کلام دکھانا شروع کر دیا۔ جیسا کہ اپنے پہلے شعری مجموعے : غلط فہمی میں مت رہنا کے دیباچے میں خود بھی رقم طراز ہیں:

سائنس کالج وحدت روڈ میں میری ملاقات اُردو کے استاد ڈاکٹر علی محمد خاں کے توسط سے پروفیسر جعفر بلوچ صاحب سے ہوئی۔ جن سے باقاعدہ اصلاح لینے کا عمل شروع کیا۔ پروفیسر جعفر بلوچ صاحب کی شخصیت، علمی استعداد اور ان کا مشفقانہ مزاج اپنی مثال آپ تھا۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا اور انھوں نے میرے اندر اچھا شعر کہنے کی خواہش پیدا کی۔

جعفر بلوچ صاحب نے ہی مجھ میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ میں عہدِ حاضر کے بڑے بڑے شعرا اور ادبا کے پاس بیٹھ کر ان سے کچھ سیکھ سکوں۔

اور میں یہ کہتا ہوں کہ پروفیسر جعفر بلوچ نے بھی تیمور کو شعر و شاعری کے نکات سمجھانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میں اس امر کا بھی شاہد ہوں کہ وہ تیمور کو ایک ہی بات کئی کئی دفعہ سمجھاتے تھے تا بہ غایت رسید۔

تادمِ تحریر تیمور حسن کے غزلوں کے دو شعری مجموعے : غلط فہمی میں مت رہنا اور تیرا کیا بنا؟ شائع ہو چکے ہیں۔ اول الذکر مجموعے کے اب تک تین ایڈیشن چھپے ہیں اور شاید وہ تیرا کیا بنا؟ کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی تیاری میں تھے کہ ناگہانی بلاوا آ گیا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے تیسرے مجموعے کی اشاعت کا بھی سوچ رہے تھے جس کا خاطر خواہ مواد یک جا ہو گیا تھا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ : تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ، یہ کچھ قدرت کو منظور نہ تھا۔ ممکن ہے ان کی اولاد میں سے کبھی کوئی اس طرف توجہ کرے اور ان کا تیسرا مجموعہ بھی شائع ہو جائے۔

تیمور حسن کے شعر پڑھنے کا انداز بڑا متاثر کن تھا۔ وہ بلند آہنگی کے ساتھ لفظوں کی ادائی اس طرح کرتے تھے کہ کوئی چاہے تو لکھ لے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہر شعر مزہ لے لے کر دوبارہ اور کسی غزل کا بیت الغزل سہ بار بھی سناتے تھے۔ انھوں نے پاکستان کے ہر بڑے شہر یا قصبے میں مشاعرے پڑھے تھے اور اس ضمن میں کبھی حیص بیص سے کام نہیں لیا تھا بلکہ ہر جگہ بڑے دبنگ انداز سے جاتے تھے اور انھوں نے تقریباً ہر مشاعرے ہی میں سامعین کو محظوظ کیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر مشاعرہ ہی لوٹا تھا۔

تیمور حسن کے ساتھ میری آخری ملاقات سائنس کالج کے صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر نعیم بزمی کے آفس میں ہوئی تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں عن قریب آسٹریلیا جا رہا ہوں تو اُس نے کہا کہ میری بہن ڈاکٹر فرح علی کو میرا اسلام ضرور کہنا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ اس دن جب ہم شعبہ اُردو کے باہر باغیچے میں کرسیوں پر براجمان تھے تو میں نے تیمور حسن سے کہا کہ تیمور حسن آج مجھے اپنی اس غزل کا صرف وہ مطلع سنا دیں، جس کی ردیف ہے : تیرا کیا بنا؟ اور اس نے فی الفور اپنے خاص انداز میں مطلع سنا دیا:

تجھے زندگی کا شعور تھا، تیرا کیا بنا؟
تو خموش کیوں ہے، مجھے بتا، تیرا کیا بنا؟

اور مجھے چوں کہ جلدی تھی اور کہیں پہنچنا تھا اس لیے میں ڈاکٹر نعیم بزمی اور تیمور حسن سے اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور یہی شعر
گنگناتا گنگناتا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا

آج جب کہ تیمور حسن تیمور کو دنیا سے رخصت ہوئے دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔ میرے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا ہے کہ ڈاکٹر تیمور حسن تیمور کی ذات ایک ایسی قندیل رہبانی تھی جو بصارت سے محرومی کے باوجود ایک ایسا شعلہ کوا تھا اور جو ہمارے بے ہنگم معاشرے کی اندھیری شب میں روشنی کا مینار ہے اور بجا طور پر تیمور حسن کی ذات کا اطلاق علامہ اقبال کے اس شعر کے مفہوم پر ضرور ہوتا ہے:

اندھیری شب ہے خدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے میرا شعلۂ نوا قندیل

✦✦✦

اردو: حیرت انگیز انکشافات

رضا علی عابدی/لندن

آج کوئی مشکل ہی سے یقین کرے گا کہ جب ہندوستان کے بڑے علاقے پر انگریزوں کی حاکمیت قائم ہوگئی اور جدید علوم کی، جنہیں آپ چاہیں مغربی علوم کہہ لیں، تعلیم شروع ہوئی تو سارے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ کیا سائنس، کیا ریاضی، کیا انجینئرنگ اور کیا زبانیں: سب اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں دہلی کالج اور حیدرآباد دکن میں جو بے مثال کام ہوا، دنیا اسے بھول چلی ہے، جس کا دکھ ہوتا ہے۔ جب سارے علاقے میں عوام کی بہبود کے تعمیراتی کام شروع ہوئے تو سو دو سو نہیں، ہزاروں انجینئروں کی ضرورت پڑی۔ ماہروں کی اتنی بڑی فوج انگلستان سے لانا ممکن نہ تھا۔ تب انگریزوں نے ہمالیہ کے دامن میں چھوٹے سے شہر روڑکی میں ایک بڑا اور جدید سول انجینئرنگ کالج قائم کیا۔ سڑکیں اور نہریں بنانے اور عمارتیں اور تار کا نظام قائم کرنے کے لئے ہندوستانی لڑکوں کو اردو میں تعلیم دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے ماہرین کی خدمات حاصل کر کے ان مضامین کی نصابی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ کالج میں اردو طباعت کا چھاپہ خانہ لگایا اور اس طرح یہ بڑا کام چل نکلا۔

یہاں جی چاہتا ہے اس داستان کے کچھ دل چسپ پہلو بیان کئے جائیں۔ سب سے پہلے دیسی ہیڈ ماسٹر مقرر کئے گئے۔ یہ سلسلہ سنہ 1847 سے 1871 تک جاری رہا۔ ان میں کچھ سروے کے استاد تھے اور کچھ ڈرائنگ کے (میرے والد بھی نئی صدی کے آغاز میں ڈرائنگ ماسٹر ہی تھے)۔ شیخ بیچا تخمینے کے مضمون کے استاد تھے اور سترہ سال تک لڑکوں کو ایسٹیمیٹ پڑھاتے رہے۔

تھامسن انجینئرنگ کالج روڑکی میں کتابیں لکھنے اور چھاپنے کے کام پر آج کے اسکالروں نے کافی تحقیق کی ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ شروع میں ساری تعلیم لڑکوں کو انگریزی زبان میں دی جاتی تھی۔ مگر ہمارے پیش نظر کتاب کے مصنف ساجد صدیق نظامی نے بڑے وثوق سے لکھا ہے کہ یہ دونوں باتیں درست نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلے دن سے ہندوستانی لڑکوں کی تعلیم ہوئی اور ان کی نصابی کتابیں اردو ہی میں چھاپی جا رہی تھیں۔ کالج کا اپنا چھاپہ خانہ سنہ 1850 کے آس پاس کام شروع کر چکا تھا۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ انجینئرنگ جیسے مضمون کی کتابیں ترجمہ کرنے کے لئے کالج میں ایک ترجمہ کمیٹی بھی مقرر کی گئی تھی۔ کالج کے قیام سے 1870 تک ہندوستانی لڑکوں کو سارے مضمون اردو میں ہی پڑھائے جاتے تھے۔ اُس وقت جدید مضامین پر کچھ کتابیں دستیاب تھیں لیکن سول انجینئرنگ کی نصابی کتابوں کا کسی نے ترجمہ نہیں کیا تھا۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس موضوع پر بنیادی کتابوں کا ترجمہ روڑکی ہی میں شروع ہوا۔ پہلے پہلے یہ کتابیں سکندرہ (آگرہ) کے آرفن پریس میں چھپتی تھیں، بعد میں کالج کا اپنا چھاپہ خانہ قائم ہوگیا۔

کالج کی زیادہ تر کتابیں دو استادوں نے ترجمہ کیں، وہ تھے منو لال اور بہاری لال۔ دونوں نے چھ چھ کتابیں اردو میں ڈھالیں۔ باقی کتابیں تیار کرنے والوں میں کنہیا لال، شمبھو داس اور شیخ بیچا کے نام شامل ہیں۔ خود منو لال نے پہلے آگرہ کے انگلش اسکول میں تعلیم پائی جہاں سے وہ روڑکی آگئے اور تعلیم پوری کر کے یہیں پڑھانے لگے۔ اسی دوران حیدرآباد دکن سے سالار جنگ نے روڑکی کالج کے پرنسپل کو لکھا کہ انہیں انجینئرنگ کے ایک استاد کی ضرورت ہے، جس پر منو لال کو وہاں بھیج دیا گیا۔ وہ حیدرآباد انجینئرنگ کالج کے نائب سربراہ مقرر ہوئے۔

دوسرے مصنف لالہ بہاری لال ہیں جو شروع ہی سے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے سات کتابیں لکھیں۔ اگلے مصنف کنہیا لال ہیں جن کی کتاب تاریخ پنجاب آج تک یاد کی جاتی ہے۔ وہ 1830 میں ایٹہ یوپی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم پوری کرنے پر لاہور میں سب اسسٹنٹ سول انجینئر مقرر ہوئے اور آخر وہیں ریٹائر ہوئے۔ لاہور کا ریلوے اسٹیشن اور میو اسپتال ان ہی کی نگرانی میں تعمیر ہوا۔ بہت کتابیں لکھیں جن میں گلزار ہندی، یادگار ہندی، ظفر نامہ معروف بہ رنجیت نامہ، مناجات ہندی، اخلاق ہندی، تاریخ پنجاب اور تاریخ لاہور آج تک حوالے کے طور پر نظر آتی ہیں۔ بعد میں کالج میں ان کے نام سے ایک انعام بھی جاری ہوا تھا۔ ان کی انجینئرنگ کی کتابوں میں رسالہ در باب آلات پیمائش نمایاں ہے۔

اُس زمانے اور اُن لوگوں کے گزر جانے کے بعد حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ کچھ بھی پہلا جیسا نہ رہا اور نہ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ یوں بھی ہوتا کہ ہم اور ہمارے بچے دنیا کا ہر مضمون اپنی زبان میں پڑھ رہے ہوتے اور جب پڑھ رہے ہوتے تو انہیں اچھی طرح معلوم ہوتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔

اب تو یہ کسی دیوانے کا خواب لگتا ہے۔

اسی بنا پر قومی زبان تحریک کا دعوی ہے کہ اردو باصلاحیت ہے اور اج بھی اسکی سرپرستی کی جائے تو میڈیکل، انجینئرنگ، سائنس، معاشیات اور دیگر سب مضامین قومی زبان میں پڑھائےجا سکتے ہیں۔

بانی و مرکزی صدر ڈاکٹر شریف نظامی۔

قیامِ امن اور ادیب

مبین مرزا/کراچی

• کراچی بدامنی کے دور میں انسانی معاشرے کو سب سے زیادہ ضرورت قیامِ امن کی ہوتی ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے میں ادیب کا کیا کردار ہے یا ہوسکتا ہے؟ ادیب کے کام کو یا معاشرے میں اُس کے کردار کو محض امن سے منسوب کرنا، سراسر ایک غلط فہمی ہے، جس سے سیاسی محرکات اور مقاصد کی بنیاد پر ہر بار بہ وقتِ ضرورت پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا مشاہدہ ہم صرف اپنے یہاں نہیں، دنیا کے کچھ اور ممالک میں بھی تاریخ کے اوراق دیکھ کر باآسانی کرسکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادیب کا فن اُس کے داخلی تقاضوں سے اپنے اظہار کے قرینے کا تعین کرتا ہے۔ تاہم یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ اُس کے داخلی تقاضوں کی صورت گری میں اس کے خارج کی صورتِ حال اور اس کے گرد وپیش کا ماحول بھی ایک اہم اور اثر آفریں قوت کا درجہ رکھتا ہے۔ تاہم اس خارجی قوت کا اثر ہر ادیب اپنی انفرادی افتادِ طبع اور داخلی کیفیت کے تحت ازخود قبول کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعروں نے صرف امن وسلامتی کے نغمے ہی نہیں گائے، بلکہ رجز بھی لکھے ہیں اور وہ دنیا کے بڑے ادب کا حصہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ہم اپنے یہاں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ء اور ء کی جنگ کے دوران ایسے قومی نغمے اور ملّی ترانے لکھے اور ذرائعِ ابلاغ (پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا دونوں) کے ذریعے پھیلائے گئے جن کا مقصد قومی جذبہ اُبھارنا اور خون کو گرم رکھنا تھا۔

اس نکتے کی طرف اشارے سے مراد یہ ہے کہ واضح طور سے سمجھ لیا جائے کہ ادیب و شاعر اپنے اطراف کی انسانی، تہذیبی اور سماجی ضرورتوں کا اثر نہ صرف قبول کرتا ہے، بلکہ ان کے زیرِ اثر خود یہ طے کرتا ہے کہ اپنی تہذیب اور سماج کے لیے اس وقت اس کا کردار کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے۔ اس کا فن کسی بھی صورتِ حال میں خارج سے ملنے والے کسی حکم یا مطالبے کا منتظر نہیں ہوتا، بلکہ اپنا کام وہ اپنی ایک فطری کیفیت کے زیرِ اثر خود کرتا ہے۔

جس سوال سے گفتگو کا آغاز کیا گیا، وہ پہلی بار نہیں اٹھایا گیا۔ دنیا کی مختلف تہذیبوں اور معاشروں نے اپنے مختلف ادوار میں اور مختلف حالات اور مسائل کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس حوالے سے بارہا گفتگو کی ہے، خود ہمارے یہاں گزشتہ سات دہائیوں میں کئی بار اس نوع کے کئی مسائل معرضِ بحث آئے ہیں، کبھی بالواسطہ اور کبھی براہِ راست۔

آج ہمارے یہاں امن کے قیام میں ادیب کا کیا کردار ہوسکتا ہے؟ دیکھا جائے تو سماج میں قیامِ امن کا مسئلہ بنیادی اور براہِ راست طور سے اہلِ ادب کے لیے نہیں، اہلِ سیاست یا انتظامیہ کے لیے سوال ہے۔ تاہم اس حوالے سے ادیب اپنی سوچ اور اپنے ردِعمل کا اظہار اپنی داخلی کیفیت کے تحت کرتا ہے۔ اِس لیے کہ اُس کا ردِعمل دراصل اُس آواز کو سامنے لاتا ہے جسے ہم انسانی ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔ یہ آواز انسانی ابتلا کے تجربے کو بیان کرتی اور اس کو مسترد کرتی ہے۔

یہ آزادی اور بنیادی سہولتوں کے ساتھ جینے کے انسانی حق پر غیر مشروط طور سے اصرار کرتی ہے۔ یہ اصل میں اُن انسانی اقدار کا اظہار ہوتا ہے جن پر ادیب یقین رکھتا ہے اور جن کے لیے نظری، فکری، لسانی، سماجی اور ثقافتی تعصبات سے بالاتر ہوکر آواز اٹھاتا ہے۔ اس لیے یہ عمل دراصل ادیب کی بنیادی ذمے داری ہے اور اس کے ادبی شعور کی بیداری کا ثبوت بھی۔

ٹامس مان کے ادبی شعور نے اس حقیقت کا ادراک پون صدی پہلے کرلیا تھا کہ عہدِ جدید کے انسان کی تقدیر اب سیاسی اصطلاحوں میں لکھی جائے گی۔ اس پر سوال کیا جاسکتا ہے، مگر کیوں؟ اس لیے کہ عہدِ جدید کے انسان کی زندگی پر سیاست نے اپنا تسلط اس طرح قائم کیا ہے کہ اب اُس کے سیاہ وسفید کا اختیار نمایاں حد تک اسی کے ہاتھ میں ہے۔

چناں چہ اب اس عہد کے انسان کا نوشتہ تقدیر اسی کے ہاتھوں اور اُسی کے الفاظ یا احکامات کے ساتھ سامنے آئے گا۔ یہ دراصل سیاسی اشرافیہ کے صدیوں کے خوابوں کی تعبیر ہے کہ وہ آج اس منزل پر ہے، لیکن غور کیا جائے تو اس حقیقت کو سمجھنا مشکل نہیں کہ یہی انسانی تہذیب واقدار کی شکست کا وہ مرحلہ کہ جس کا اس سے قبل کی انسانی زندگی میں کوئی ثبوت نہیں ملتا، مگر یہ ایک الگ موضوع ہے، ہم فی الحال اپنے مسئلے کی طرف لوٹتے ہیں۔

ان سب باتوں کے ساتھ ہمیں اس حقیقت کو بھی ہرگز نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ کسی بھی سماج میں قیامِ امن کا مسئلہ ادیب کی قوتِ کار سے باہر کی چیز ہے۔ ادیب اس کے لیے آواز ضرور اُٹھاتا ہے، لیکن جیسا کہ عرض کیا، معاشرے میں بدامنی اور انتشار کو ختم کرکے امن کو ممکن بنانا سیاسی مقتدرہ کا کام ہے، اس لیے کہ اس کام کی انجام دہی کے لیے جس قوتِ نافذہ کی ضرورت ہے وہ ادیب کے نہیں، پارلیمان کے اراکین اور انتظامیہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

اس لیے یہ کام ان شعبوں کے افراد اور اداروں

کی فکری و عملی ہم آہنگی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ قانون کی عمل داری کا معاملہ ہے جو اُسی وقت ممکن ہے جب قانون نہ صرف موجود ہو، بلکہ اسے قوتِ نافذہ بھی حاصل ہو۔

اب جہاں تک بدامنی کا معاملہ ہے تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ آج صرف ہمارا نہیں، عالمی سطح کا مسئلہ ہے، بلکہ سیاست اور صحافت سے وابستہ بعض افراد نے تو واضح لفظوں میں کہا ہے کہ یہ آج کی انسانی دنیا کا کسی بھی تخصیص کے بغیر، سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ دنیا کا کوئی خطہ، کوئی ملک اور کوئی سماج آج ایسا نہیں جو اس مسئلے سے کسی نہ کسی سطح پر متاثر نہ ہو۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ، کہیں ایک اور کہیں دوسری شکل میں افراد اور سماج اس کا شکار ہیں یا اس سے نبرد آزما ہیں۔

تاہم اس دور کے مسائل اور ارضی حقائق کو بڑے سیاق وسباق میں دیکھنے والے اذہان اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ بدامنی کا یہ مسئلہ ایسا سادہ نہیں ہے، جیسا کہ ماضی میں ہوا کرتا تھا۔ آج اس کے محرکات متنوع ہیں اور ان کو اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے والی قوتیں بھی متعدد ہیں جو دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے انداز سے کام کر رہی ہیں۔ اس حوالے سے نوم چومسکی نے کئی ممالک میں اس مسئلے کو اٹھایا اور ایک سوشیو پولیٹیکل ڈس کورس تشکیل دیا ہے۔

اگر ہم اپنی مخصوص صورتِ حال پر غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں انتشار اور بدامنی کئی شکلوں میں پائی جاتی ہے۔ دہشت گردی اور امنِ عامہ کا مسئلہ اس کا صرف ایک مظہر ہے۔ اس کے علاوہ سماجی استحصال، سیاسی عدم برداشت، گروہی تعصب، لسانی تفریق اور ثقافتی اختلاف نے ہمارے یہاں مختلف صورتوں اور متعدد سطحوں پر بدامنی کو فروغ دیا ہے۔ اس لیے ہمارے یہاں یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ اور اذیت ناک ہے۔

جہاں تک دہشت گردی کا معاملہ ہے، جب سے افواجِ پاکستان نے براہِ راست آپریشن کی حکمتِ عملی اختیار کی ہے، اس کی شدت میں تخفیف بہرحال دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نوع کے اقدامات قومی سطح پر ایک سیاسی، معاشی اور اخلاقی قیمت طلب کرتے ہیں اور انسانی جانوں کے زیاں کا ایک تناسب بھی حالات کے مکمل طور سے گرفت میں آنے تک اس میں شامل رہتا ہے، لیکن یہ بھی طے ہے کہ موثر اور دیرپا نتائج کے حصول کا یہ ایک اہم راستہ ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دریں صورت ہمارے پاس تو صرف یہی راستہ باقی بچا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس سے پہلے عملی اقدامات کے حوالے سے ہمارے پاس جو انتخابات ممکن تھے، ان میں کچھ قطعی غیر موثر ثابت ہو چکے تھے اور انھی کے تجربے کی روشنی میں بعض دیگر طریق ہائے کار پہلے ہی سے بے معنی نظر آنے لگے تھے۔ سو ضرورت اس بات کی تھی کہ اب اس مسئلے کو حربی قوت کے ساتھ نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کے دفاع کی حکمتِ عملی کے مطابق دیکھا اور اختیار کیا جائے۔

اس گفتگو سے یہ تاثر دینا ہرگز مقصود نہیں ہے کہ ان حالات میں ملکی، تہذیبی اور سماجی سطح پر آج ہمیں ادیب کا کوئی کردار مطلوب نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس ضمن میں جن اداروں کا کردار موثر ہوسکتا ہے، اب وہ میدانِ عمل میں آچکے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے، اس کے باوجود ان حالات میں ادیب کا کردار اپنی جگہ ہے اور اُس کی ضرورت اور اہمیت بھی اپنی جگہ ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ادیب سیاسی مقتدرہ کا حصہ نہیں ہوتا، اس لیے وہ قوتِ نافذہ کا حامل نہیں ہے اور نہ ہی اس کو استعمال کرنے کا مکلف ہے، لیکن اس حقیقت کی نفی بھی نہیں کی جاسکتی کہ افرادِ قوم کی ذہن سازی میں ادیب کا ایک اہم اور موثر کردار بہرحال ہوسکتا ہے۔ یہ کردار وہ عملاً دو سطحوں پر ادا کرتا ہے۔

نظریاتی اور ذہنی سطح پر اپنی تحریروں کے ذریعے، جیسا کہ سب بڑے ادیب ایسے حالات میں اپنے اپنے معاشروں میں ادا کرتے آئے ہیں اور وجودی سطح پر اُس طرح جیسے سارتر، ایذرا پاؤنڈ، سولزے نتسن اور نجیب محفوظ وغیرہ۔ ہم نے اپنے اپنے ادوار اور ممالک میں سامنے آکر اپنی سیاسی اشرافیہ اور اہلِ اقتدار کی پالیسی سے عملاً اختلاف کرتے ہوئے کیا، اور جیسا کہ نوم چومسکی اور ارون دھتی رائے جیسے لوگ اپنے اپنے سماج میں آج بھی کر رہے ہیں۔

اس کے لیے ادیب کو دو چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے اس نوع کے اقدام کی اخلاقی قیمت چکانے پر ذہنی طور سے آمادہ ہو اور دوسرے یہ کہ اپنے معاشرے میں نفوذ کی استعداد رکھتا ہو۔ نفوذ کی استعداد اُسے تبھی بہم ہوسکتی ہے جب اس نے اپنے ادبی اظہار میں ذاتی مفاد اور مصلحت کا راستہ اختیار نہ کیا ہو، بلکہ اُس کے فکری، تخلیقی اور عملی اقدام کی بنیاد اُس کی روح کی پکار اور ضمیر کی آواز پر ہو۔

ادیب کی روح کی پکار انسانیت پر اُس کے یقین اور غیر مشروط انسانی محبت سے پیدا ہوتی ہے اور اس پکار کو مستحکم کرتا ہے اس کا اپنے سماج سیسچا اور گہرا رشتہ۔ یہ رشتہ اُس کے الفاظ میں برقی حرارے دوڑا دیتا ہے اور وہ تاثیر پیدا کر دیتا ہے جو دلوں کو بدل ڈالتا ہے، قوموں کی قلبِ ماہیت کرتی ہے اور وقت کو ٹھہرا کر اُس کی صورت گری کرتی ہے، تب فرانس نیا جنم لیتا ہے، امریکا خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا ہے اور روس کو اپنے اندر جھانکنے والی نظر میسر آتی ہے۔

ہمارا عہد اور اُس کا ادب اپنے ادیب سے آج اسی کردار کا متقاضی ہے۔

لیاقت علی عاصم

مجھے دورا ہے پہ لانے والوں نے یہ نہ سوچا
میں چھوڑ دوں گا یہ راستہ بھی وہ راستہ بھی

چراغ بھی دسترس سے باہر ہے اور ہوا بھی
عجیب ہوتا ہے نارسائی کا سلسلہ بھی
یہ گردشوں کے عجیب دن ہیں عجیب راتیں
کہ دل کو دھڑکا ہے ہجر کا بھی وصال کا بھی
مجھے دورا ہے پہ لانے والوں نے یہ نہ سوچا
میں چھوڑ دوں گا یہ راستہ بھی وہ راستہ بھی
گداز ہوتا نہیں ہے پانی میں رہ کے پتھر
ہمارے حلقے میں آ کے بدلا نہ وہ ذرا بھی
دُرونِ صحرائے ذات کب سے بھٹک رہی ہے
تری رعونت کے سائے سائے مری انا بھی
یہ کون مجھ میں سما گیا ہے کہ آج مجھ سے
گریز کرنے لگی ہیں آنکھیں بھی آئنہ بھی

کارِ عشق آزما کرے کوئی
ضبط کو ضابطہ کرے کوئی
چاند پر جائے یا ستارے پر
آدمی کا بھلا کرے کوئی
دار کا سامنا کیا سب نے
یار کا سامنا کرے کوئی
کچھ تو کم ہو یہ شورشِ دریا
ڈُوب جائے خدا کرے کوئی
کوئی اپنے سوا نہیں موجود
اور ہے تو ہوا کرے کوئی
وصل کے خواب دیکھ لیتا ہوں
ہجر میں اور کیا کرے کوئی
اپنی خوشبو سے میرے ہوتے ہوئے
کیوں پریشاں پھرا کرے کوئی
اور مقصودِ آئنہ کیا ہے
خود پہ حیرت کیا کرے کوئی
دوستی ہو کہ دُشمنی ہم سے
گاہے گاہے ملا کرے کوئی
عاصم آخر زمیں ہے غالب کی
کس طرح حق ادا کرے کوئی

ایک ہی موج میں بہا ہوں میں
اور اس پار جا لگا ہوں میں
نیند آتی ہے یا نہیں آتی
الغرض خواب دیکھتا ہوں میں
خواب میں ہاتھ تھامنے والے
دیکھ بستر سے گر پڑا ہوں میں
دل میں ایسی شکست و ریخت ہے اب
ہر کھلونا خریدتا ہوں میں
کیوں قدم اُٹھ رہے ہیں عجلت میں
کیا بہت پیچھے رہ گیا ہوں میں
اک طرف دوش اک طرف فردا
درمیاں سے گزر رہا ہوں میں

خواب تعبیر میں ڈھلتے ہیں یہاں سے آگے
آ نکل جائیں شبِ وہم و گماں سے آگے
رنگ پیراہنِ خاکی کا بدلنے کے لیے
مجھ کو جانا ہے ابھی ریگِ رواں سے آگے
اک قدم اور سہی شہرِ تنفس سے اُدھر
اک سفر اور سہی کوچۂ جاں سے آگے
اُس سفر سے کوئی لوٹا نہیں کس سے پوچھیں
کیسی منزل ہے جہانِ گزراں سے آگے
میں بہت تیز ہواؤں کی گزرگاہ میں ہوں
ایک بستی ہے کہیں میرے مکاں سے آگے
میری آوارگی یوں ہی تو نہیں ہے عاصم
کوئی خوشبو ہے مری عمرِ رواں سے آگے

جانے کس خود بیں کے ہاتھوں سے گرا ہے آئنہ
فرشِ شب پر کرچیوں میں بٹ گیا ہے آئنہ
جس نے دیکھا ہو گیا وہ اپنی صورت کا اسیر
جانے کس خوش فہم کا سوچا ہوا ہے آئنہ
خشک ٹہنی ہو تو صحرا پھول ہو تو پھول بن
جیسی قربت ویسا ہی قربت نما ہے آئنہ
دل میں گھر کرنا پڑے گا آنکھ تک آ کر تمہیں
حُسن کی منزل نہیں ہے راستہ ہے آئنہ
آدمی قانونِ فطرت کو بدل سکتا نہیں
سنگ اب تک سنگ ہے اور آئنہ ہے آئنہ
آئنے کی اُس اذیت ناک خاموشی کے بعد
عمر بھر میں نے تمہیں پوچھا کہ کیا ہے آئنہ

صورتِ موج سمندر میں کہاں سے آیا
میں مسافر کی طرح گھر میں کہاں سے آیا
خواہشِ خود نگری سبز ہوئی کس رُت میں
آئنہ دستِ سکندر میں کہاں سے آیا
سر دریچوں سے نکل آئے صدا سنتے ہی
یہ ہنر تیرے گداگر میں کہاں سے آیا
مرکزِ گل تھا سو اب خاک نظر آتا ہے
یہ تغیر مرے بستر میں کہاں سے آیا
میری راتیں بھی سیہ دن بھی اندھیرے میرے
رنگ یہ میرے مقدر میں کہاں سے آیا
گفتگو کی ہمیں توفیق نہیں بچوں سے
فصل ایسا مہ و اختر میں کہاں سے آیا
کس نے کھینچا مری تنہائی کا نقشہ عاصم
دشت اس شہر کے منظر میں کہاں سے آیا

میاں مزمل لطیف/ جرمنی

معاصر شاعری کی ترقی وترویج میں جس طرح ملکی طور پر بہت سے شعرا کوشاں رہتے ہیں اسی طرح دیارِ غیر میں رہنے والے شاعر بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جرمنی کے شہر برلن میں رہنے والے میاں مزمل لطیف بھی ایک ایسے ہی تازہ کار شاعر ہیں۔ جنھوں نے اپنے تخلیقی اظہار کی تازگی سے ادبی حلقوں کو اپنی طرف مائل کیا ہے۔ اُن کی تخلیقیت میں غزل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ جتنی سہولت سے غزل کہتے ہیں۔ پڑھتے ہوئے ایک طمانیت اور سرشاری کا احساس ہوتا ہے۔ جلد ہی اُن کا شعری مجموعہ بھی آ رہا ہے۔ جو یقیناً اردو شاعری میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ (افضل گوہر)

اک زخمِ غمِ یار کا مارا ہوا ہوں میں
اے زیست تری دوڑ میں ہارا ہوا ہوں میں
میں برسوں تلک درد کے صحرا میں رہا ہوں
تب جا کے کسی ندیا کا دھارا ہوا ہوں میں
آئی ہے نظر کون سی وہ بات کے ہمدم
اب حد سے زیادہ تجھے پیارا ہوا ہوں میں
لگتا ہے کئی بار تجھے مل کے مجھے یوں
اک عمر ترے ساتھ گزارا ہوا ہوں میں

ہمارے پیار میں کچھ تو کمال رکھا ہے
کہ تو نے حسن کو اپنے سنبھال رکھا ہے
تجھے ملے گا کہاں اور کوئی مجھ جیسا
کہ تاج سر ترے قدموں میں ڈال رکھا ہے
تمھاری نفرتوں کو قید کرنے کی خاطر
بنا کے ہم نے وفاؤں کا جال رکھا ہے
نظر ہٹاتا نہیں کوئی دیکھنے والا
خدا نے حسن میں ایسا کمال رکھا ہے
یہ دنیا بھول چکی ہے نجانے کب سے لطیف
جو صدمہ دل نے ترے اب بھی پال رکھا ہے

زمانہ ایسے چلتا جا رہا ہے
کہ سب کچھ ہی بدلتا جا رہا ہے
وصالِ یار نے وہ آگ بھر دی
بدن بارش میں جلتا جا رہا ہے
ہماری سانس کتنی ریشمی ہے
سرا سب سے پھسلتا جا رہا ہے
کوئی حسرت تو ہے سورج کے دل میں
کہ صدیوں سے پگھلتا جا رہا ہے
تو حاصل تھا تو وہ بھی کتنا خوش تھا
بچھڑ کر ہاتھ ملتا جا رہا ہے
تجھے دیکھا ہے جب سے آنکھ بھر کے
یہ دل ہے کہ مچلتا جا رہا ہے

جہاں پر انحصارِ زندگی ہے
وہیں پر ختمِ کارِ زندگی ہے
جہاں پر عشق والفت کی ہوں باتیں
وہیں پر تو بہارِ زندگی ہے
جہاں پر دشمنِ جاں ہو محافظ
وہاں کیا اعتبارِ زندگی ہے
جہاں احساس ہو چھوٹے بڑے کا
وہیں پر انکسارِ زندگی ہے
جہاں پر دشمنِ جاں ہیں ہزاروں
وہیں پر کوئی یارِ زندگی ہے
جہاں پر سرد مہری ہے دلوں میں
وہیں مجھ میں خمارِ زندگی ہے

اسی لئے تو وفاؤں کا ہے رواج الگ
ترا مزاج الگ ہے مرا مزاج الگ
بدل رہا ہے جہاں کا مزاج کچھ ایسا
کہ لگ رہا ہے ہمیں اپنا کل سے آج الگ
ہماری علم کی دولت تمھاری دنیا کی
ہمارا راج الگ ہے تمھارا راج الگ
بٹھا کے خواہشِ دنیا تخت پر رکھا
مگر ہے سر پہ غریبی کا اپنے تاج الگ
تمام عمر اسی سوچ میں گزارتی ہیں
کہ بیٹیوں کا بناتی ہیں مائیں داج الگ
بہت سکھاتے ہیں ماں باپ بھی لطیف ہمیں
سبق پڑھاتا ہے لیکن ہمیں سماج الگ

تیری خاطر جو صرف خواب ہیں ہم
پھر بتا کس کا انتخاب ہیں ہم
یہ مری ماں کی سب دعائیں ہیں
زندگی میں جو کامیاب ہیں ہم
تُو ہمیں کیوں دِیا سمجھتا ہے
رات کو دیکھ ماہتاب ہیں ہم
وقت نے اس طرح بدل ڈالا
پہلے اچھے تھے اب خراب ہیں ہم
ہم کو دیکھو ہماری انکھوں سے
چشمِ دُنیا میں بے حجاب ہیں ہم
ہم ہیں دُنیا میں رازِ سر بستہ
لوگ کہتے ہیں لاجواب ہیں ہم

طنز و مزاح

ممتاز تشنہ صاحب سے ایک ملاقات

عطاء الحق قاسمی/ لاہور

ہمارے انٹرویو نگار دنیا جہان کے موضوعات کے ماہرین سے انٹرویو کرتے ہیں۔ آپس میں بھی سارا وقت ان کی ادبی، قومی اور بین الاقوامی معاملات پر ہی گفتگو رہتی ہے۔ میں نے برصغیر پاک و ہند، نیپال، بنگلہ دیش اور بھوٹان کے ممتاز شاعر ممتاز تشنہ صاحب سے ایک انٹرویو کیا تاکہ ان دوستوں پر واضح ہو کہ انٹرویو اس طرح کیے جاتے ہیں۔ اس انٹرویو کا ایک حصہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

تشنہ صاحب ! آپ یہ بتائیں کہ آپ نے اپنا تخلص تشنہ کیوں رکھا؟

یہ آپ نے بڑا اچھا سوال پوچھا۔ جی بات دراصل یہ ہے کہ میرے گاؤں سے سکول کافی دور تھا اور یہ سارا رستہ مجھے پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ سکول پہنچتے پہنچتے پیاس سے برا حال ہو جاتا تھا اور چونکہ سکول میں پانی کا کوئی مناسب بندوبست نہ تھا لہذا میں نے اپنا تخلص تشنہ رکھ لیا۔

بہت خوب، مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ تشنہ تخلص رکھنے سے پہلے آپ شعر کہتے تھے یا تخلص رکھنے کے بعد آپ نے شاعری شروع کی؟

اصل میں تخلص رکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اب شاعری بھی شروع کر دینی چاہیے۔ کیونکہ آدمی نے تخلص رکھا ہو، مگر وہ شاعری نہ کرے تو اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ وہ ماچس جیب میں رکھتا ہو، لیکن سگریٹ نہ پیتا ہو! باقی سوال ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے آپ بتائیں کہ آپ اپنے نیفے میں چاقو تو نہیں رکھتے؟

صاحب ! آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ اگر کوئی اپنے نیفے میں چاقو رکھتا بھی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دو چار قتل بھی ضرور کرے!

بس ٹھیک ہے ہماری تسلی ہو گئی۔ اب آپ یہ بتائیں کہ تخلص کے علاوہ کون سے محرکات تھے جنہوں نے آپ کو شاعری کی طرف راغب کیا؟

یہ دراصل میرا ادبی ماحول تھا جو مجھے ورثے میں ملا۔ میرے والد محترم بڑے پائے کے شاعر تھے۔ بنیادی طور پر قوالی ان کا پیشہ نہیں تھا۔ صرف اپنے کلام کو زیادہ موثر انداز میں پیش کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ چنانچہ انہیں بہت دور دور سے بلایا جاتا تھا۔ خصوصاً عرسوں وغیرہ کے موقع پر ان کی مانگ بہت بڑھ جاتی تھی۔ میں ان دوروں میں ان کے ساتھ ہوتا اور سٹیج پر والد صاحب کے برابر میں بیٹھے ہوئے ان کے احباب کے ساتھ مل کر تالی بجایا کرتا تھا۔ میرے ادبی کیریئر کا آغاز یہیں سے ہوا۔

ماشاءاللہ کیا آپ ہمیں یہ بتانا پسند کریں گے کہ اتنے زبردست ادبی آغاز اور پھر ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے باوجود آپ کو مشاعروں میں کیوں نہیں بلایا جاتا؟

صاحب بڑی سیدھی سی بات ہے کہ میں گوشہ نشیں سا آدمی ہوں۔ اگر کوئی محبت سے کسی شادی بیاہ کی تقریب میں بلائے تو وہاں سہرا پڑھ دیتا ہوں۔ ایک وقت تھا جب آواز بھی اچھی تھی، اس وقت ذرا چار پیسے زیادہ مل جاتے تھے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اب بھی لوگ قدر کرتے ہیں۔ ممتاز عالم جنتری والے مجھ سے میرا کلام فرمائش کر کے لے جاتے ہیں اور بڑے اہتمام سے جنتری میں شائع کرتے ہیں۔ باقی رہا مشاعروں کا مسئلہ تو مجھے متعدد باران مشاعروں میں شرکت کا دعوت نامہ اخبار کے کالم اطلاعات و اعلانات کے ذریعے موصول ہوا۔ مگر صاحب مشاعروں میں آج کل جس طرح کی اوٹ پٹانگ چیزیں پڑھی جاتی ہیں، وہاں ثقہ شاعروں کو کون پوچھتا ہے ! چنانچہ ان مشاعروں میں سٹیج سیکرٹری کو کتنی ہی چٹیں موصول ہوئیں کہ خوش قسمتی سے اس وقت ممتاز شاعر تشنہ صاحب ہال میں موجود ہیں۔ انہیں بھی زحمت کلام دی جائے، مگر سٹیج سیکرٹری ان چٹوں کو اپنے زانو تلے دبا کر بیٹھ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید یہ چٹیں ہینڈ رائٹنگ بدل بدل کر میں خود لکھ رہا ہوں۔ اب آپ فرمائیے میں اس قسم کی محفلوں میں کلام کیونکر سنا سکتا ہوں جن کے سٹیج سیکرٹری سخن فہم ہونے سے زیادہ ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ ہونے کے دعویدار ہوں؟

یہ تو واقعی افسوس ناک صورتحال ہے، مگر تشنہ صاحب ایک مشاعرے کی روداد میں نے پڑھی تھی جس میں کچھ ہلڑ بازی بھی ہوئی تھی، اس میں آپ کا ذکر بھی آیا تھا، وہ کیا قصہ تھا؟

وہ جناب معاملہ یوں ہے کہ مجھے اس مشاعرے کا دعوت نامہ بھی اطلاعات و اعلانات والے کالم ہی کے ذریعے موصول ہوا تھا۔ میں نے سوچا مشاعرے کے نوجوان منتظمین کی دل شکنی نہیں ہونی چاہیے۔ سو میں وہاں چلا گیا۔ چنانچہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی منتظمین سے ملا، تعارف کرایا اور کہا آپ نے یاد فرمایا تھا، حاضر ہو گیا ہوں۔ بڑے سعادت مند نوجوان تھے، انہوں نے بڑی تکریم کی اور کہا آپ کا کرم آپ تشریف لائے۔ برائے مہربانی سامعین کی

صفوں میں تشریف رکھیں۔ دراصل وہ جانتے تھے کہ میں خودنمائی سے کوسوں دور ہوں۔ شاعروں کے ساتھ سٹیج پر بیٹھنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا، مگر صاحب ہوا یوں کہ آدھا مشاعرہ گزر گیا مگر انہوں نے میرا نام نہیں پکارا لیکن جب انہیں تین چار چٹیں اس مضمون کی موصول ہوئیں کہ خوش قسمتی سے اس وقت ممتاز شاعر ممتاز تشنہ صاحب بھی ہال میں موجود ہیں، انہیں زحمت کلام دی جائے تو وہ بہت پشیمان ہوئے اور مجھے فوراً سٹیج پر بلایا۔ میں نے جب وہاں اپنی مشہور غزل کا یہ مطلع پڑھا:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

تو ہال میں سے اتنی داد موصول ہوئی کہ لگا جیسے ہنگامہ ہوگیا ہے۔ ایک مداح تو سٹیج پر چڑھ آیا اور اس نے مجھے گلے لگانے کے لیے اپنے بازو میرے بازوؤں اور اپنی ٹانگیں میری ٹانگوں میں اس طرح پیوست کیں کہ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سٹیج سے نیچے جا گرا۔ لوگ اظہارِ عقیدت کے طور پر سیٹیاں بجا رہے تھے اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہاں لوگوں نے برملا کہا کہ میں تمام شاعروں پر غالب ہوں۔ یہ تھا واقعہ جسے اخبار کے ڈائری نویس نے ہلڑ بازی کا نام دیا اور میرے مشاعرے پر غالب آنے کے برملا اعتراف کو اس ڈائری نویس نے غالب سے جاملایا۔

تشنہ صاحب! سنا ہے محبت کے بغیر شاعری نہیں ہوتی، آپ بھی کبھی اس تجربے سے گزرے ہیں؟

صاحب! یہ آپ نے کیا سوال کردیا۔ جوانی یاد آگئی ہے۔ اس موضوع پر تو میرا یہ شعر بھی بہت مشہور ہے:

داور حشر میں میرا نامہ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، مگر کیا یہ شعر ڈاکٹر تاثیر کا نہیں؟

بندہ پرور آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اس شعر کا ذکر اس کی تاثیر کے حوالے سے ہوتا ہے۔ آپ نے اسے ڈاکٹر تاثیر کے کھاتے میں ڈال دیا۔ بہت افسوس کی بات ہے! اب ایک آخری سوال! آپ نے اپنے لیٹر پیڈ پر ممتاز شاعر ممتاز تشنہ لکھوایا ہے۔ یہ جو آپ کے نام میں دو دفعہ لفظ ممتاز آیا ہے تو کیا یہ اسی طرح ہے جس طرح امجد اسلام امجد کے نام میں دو دفعہ امجد آتا ہے؟

صاحب! آپ بھی بڑے بذلہ سنج ہیں ممتاز شاعر تو مجھے لوگ لکھتے ہیں۔ تشنہ میرا تخلص ہے۔ والدین نے میرا نام کچھ اور رکھا تھا مگر میں نے اپنے لیے ممتاز کو پسند کیا اور یوں لوگ مجھے ممتاز شاعر ممتاز تشنہ کہتے ہیں۔

آپ نے ابھی کہا ہے کہ آپ نے اپنے لیے ممتاز کو پسند کیا، کیا ممتاز بھی آپ کو پسند کرتی ہے؟ نیز یہ کہ فلمی دنیا سے بھی آپ کا کوئی تعلق ہے؟

جی ممتاز صاحبہ سے تو میں دلی ارادت رکھتا ہوں اور فلمی دنیا سے تو بس تھوڑا! بہت تعلق ہے۔ پچھلے دنوں آپ نے فلم جوانی "میں قوالی کا ایک منظر دیکھا ہوگا۔ قوالوں میں یہ خادم بھی موجود تھا، اخباروں نے میرے کام کی بہت تعریف کی تھی۔

احمد ندیم رفیع
(امریکا)

غزل

پہلو میں ہم نے یار کے کیا کچھ نہیں کیا
اپنی انا کو مار کے کیا کچھ نہیں کیا

کب بیٹھنے دیا ہے تقاضائے عشق نے
زلفِ دوتا سنوار کے کیا کچھ نہیں کیا

اِس شامِ انتظار کی سَرمستیاں نہ پوچھ
جُز تیرے انتظار کے کیا کچھ نہیں کیا

چھانی ہے خاکِ دشتِ تمنا کہاں کہاں
ہم نے تجھے پکار کے کیا کچھ نہیں کیا

لوٹے ہیں روز کوچۂ جاناں سے نامراد
سائل کا رُوپ دھار کے کیا کچھ نہیں کیا

صبحِ نشاط ہم سے خفا تھی، خفا رہی
شب ہائے غم گزار کے کیا کچھ نہیں کیا

ڈھانپے گئے نہ پھر بھی عیوبِ برہنگی
میلا بدن اُتار کے کیا کچھ نہیں کیا

شاعروں کے تخیلات پر کچھ ادبی اجتہاد

امجد محمود چشتی/ میاں چنوں

بھلے عمل میں متحرک نہ سہی مگر شعراء معاشرے کے انتہائی ذہین لوگ ہوتے ہیں اور ان کی پروازِ تخیل ،ماورائے ثریا ہوتی ہے۔یہ بڑے بڑے انقلابوں ،بلووں اور معاشقوں کے راہ ہموار کرتے ہیں۔بس زرا عائلی اور خاص کر مالی حالات ناگفتہ بہ رہتے ہیں۔شعرا تعارف کے سوا ہر شئے کے محتاج ضرور سہی مگر خودداری و وضع داری کے موجب اظہارِ احتیاج کے محتاج نہیں ہوتے۔شیکسپئر نے تو مذاق میں کہا تھا کہ شاعر، عاشق اور پاگل کا تخیل ایک جیسا ہوتا ہے اور اسلام نے بھی بس مصلحتاً شاعری کی حوصلہ شکنی کی مگر وہ شعرا اور علماء کے سوا کون ہیں جو ایک پھول کے عنوان کو سو رنگ سے باندھ سکیں۔ادب سے شغف رکھنے والوں نے شاعروں کو خوب پڑھ رکھا ہے ۔پرانے شاعروں کے کئی تخیلات آج کے تقاضوں سے میل کھاتے نظر نہیں آتے۔اس لیے راقم نے چند شعرا کے کچھ اشعار کو،، مکافاتِ تخیلات،، سے دوچار کرنے کی جسارت کی ہے۔سبطِ حسن نے اپنی کسمپرسی کا رونا ایسے رویا ۔

دیوار کیا گری میرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

مانا کہ پرانے شاعر پکے مکان بنانے کی استطاعت اور نیت نہیں رکھتے تھے مگر آج سوشل میڈیا کی بدولت ایک متشاعر بھی متمول ہے۔لہٰذا ایسی ناشکری مناسب نہیں۔اب اس تخیل کو کچھ ایسے بدلتے ہیں کہ،

دیوار کیوں گرے میرے پختہ مکان کی؟
کیوں لوگ میرے صحن سے رستے بنا سکیں؟

احمد فراز اگرچہ خاصے متمول تھے مگر شاعرانہ خصوصیات سے بھی مجبور تھے۔ایک جگہ لکھا کہ

ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز
کچا تیرا مکان ہے کچھ تو خیال کر

مگر اب شاعروں کے گھروں کی ایسی صورت حال نہیں دِکھتی۔ویسے بھی شاعر بادل، بارش اور ساون کے دلدادہ ہوتے ہیں۔میں تو کہوں گا کہ

ان بارشوں سے دوستی جاری رکھو فراز
پکا تیرا مکان ہے کچھ نہ ملال کر

میر تقی میر سے منسوب اس شعر میں بڑی دور کی پھینک گئی کہ ارشد ندیم بھی پیچھے رہ گئے ۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

مگر آج موم بتی کی ضرورت نہیں رہی اس لیے ہمارے خیال میں اب مگس کو باغ میں جانے کی اجازت دے دینی چاہیے، کہ

مگس کو باغ میں اب جانے دیجو
نہیں اب خون پروانے کا ہوگا

اقبال جیسے عظیم شاعر نے نرگس کو مایوس اور احساسِ کمتری کا شکار کر دیا کہ وہ ہزاروں سال روتی ہے تب کوئی اس کو چاہنے والا ملتا ہے۔مگر ہم نرگس کو یہ کہہ کر موٹیویٹ کرتے ہیں ،کہ

بڑی بے عقل ہو نرگس جو بے نوری پہ روتی ہو
بنا چینل تو ہو جائیں ہزاروں دیدہ ور پیدا

ایک اور جگہ اقبال نوجوانوں کو تعیشات سے بددل کر کے پہاڑوں پر رہنے کا مشورہ دیتے ہیں ۔لیکن ہمارا مشورہ تو یہ ہوگا

بنا اپنا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
نہ شاہیں بن کے دھکے کھا پہاڑوں کی چٹانوں پر

اسی لیے تو اقبال کے سارے شاہین اڑنے کی کوشش میں رہتے ہیں ۔پھر حضرت اقبال نے کسانوں کو فصل اچھی نہ ہونے کی صورت میں کھلیان ہی جلا دینے کا مشورہ دے ڈالا۔ہم ان سے اتفاق نہیں کرتے، بلکہ ہمارے خیال میں ،

جس کھیت سے دہقاں کو ملے سال کی روٹی
کیوں اس کے ہر اک خوشہ گندم کو جلا دیں

علامہ اقبال مغربی تہذیب سے سخت نالاں تھے اور اپنی ملت کو اقوام مغرب پر قیاس نہ کرنے کا درس دیتے گئے۔مگر وقت نے کچھ اور ثابت کر دیا اور ہم مغرب کے مقابلے میں اتنا پیچھے رہ گئے کہ کسی دردمند کو یہ لکھنا پڑ گیا، کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
تُو کتھے تھے اوہ کتھے کچھ تاں خدا دا خوف کر

ادھر امجد اسلام امجد کے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برسیں تو محبوب کو بھلا دینے پر آ گئے۔پر ہم اس سلسلے میں کچھ جارحانہ خیالات رکھتے ہیں کہ

وہ ترے نصیب کی بارشیں یہاں میری چھت پہ برس گئیں
وہ تو کب کی تجھ کو بھلا چکی، میری بات سن تُو بھی بھول جا

جب ،،آتش،، جوان تھے تو محبوب کو گُل کے روبرو کرنے کی حسرت رکھتے تھے۔مگر ہم نے اپنے دور میں کچھ اور دیکھا اور چاہا جیسے

گزر گئی ہے سیاست پہ گفتگو کرتے
بسر ہوئی ہے وطن کو بے آبرو کرتے

فراز اگرچہ جہاندیدہ اور زیرک شاعر تھے مگر سادگی دیکھیئے کہ تکلف کو اخلاص سمجھتے رہے، لیکن ہم تکلف کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ

ہم تکلف کو سراسر ہی سمجھتے ہیں فراڈ
دوست کیوں ہو سکے ہر ہاتھ ملانے والا

شیخ سعدی جوانوں کو جوانی میں توبہ کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔مگر جوان عین فطرت پر زندگی

کرتے گئے۔ اسی لیے ہم حقیقت پسندانہ رائے رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ

وقتِ پیری توبہ کردن شیوۂ ہر آدمی
در جوانی ہر کس وناکس شوُد فتنہ شعار

ماضی میں جذباتِ ملیہ سے سرشار بزرگ دنیا سے جاتے وقت نئی نسل کو یوں کہہ کر رخصت ہوتے تھے۔

ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے
اس ملک کو رکھنا میرے بچو سنبھال کے

مگر وطنِ عزیز میں ہم نے جو اپنی زندگی میں دیکھا، سمجھا اور جانا، فقط یہی تھا کہ

ہم تو چلے طوفان میں کشتی کو ڈال کے
کوئی بھلا دکھائے بھنور سے نکال کے

میر تقی میر زندگی کی بے ثباتی سے خائف تھے اور آفاق کی منزل سے سامان لٹا کر گزرنے کے قائل تھے۔ پر آج کے طاغوتی دور میں لوگ ان باتوں سے نہیں ڈرتے۔ آج کا دور ساحلوں اور قبروں کا دور ہے اور اس شعر کو کسی نے خوب بدلا ہے کہ۔

طاغوت کی منزل سے گیا کون سلامت
سامان لُٹا،، رات،، میں یاں ہر قمری کا

بہت سے شعراء اور ان کے تخیلات سے ہم نے اختلاف کیا مگر آخر میں آتش کے اس شعر سے اختلاف نہ کرنے کا اعلان کرتے ہیں جس میں وہ،، عندلیب،، کو مل بیٹھ کر آہ زاریاں کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ لمحہ موجود کی مہنگائی کے تناظر میں بس ایک لفظ کی تبدیلی سے ان کے تخیل سے اتفاق کرتے ہیں،،

آ، عندلیب مل کے کریں آہ زاریاں
تُو ہائے گُل پکار میں چلاؤں ہائے بل

افضل گوہر راؤ

پھلروان

جس شخص کو دشمن کے ٹھکانے کا پتہ ہے
دراصل اُسے سارے زمانے کا پتہ ہے

بھرتا ہی نہیں پیٹ کبھی دل کی ہوس کا
اِس سانپ کو بھی ایک خزانے کا پتہ ہے

مسند کی تمنا میں مرے جاتے ہیں یوں ہی
وہ لوگ جنھیں گھر نہ گھرانے کا پتہ ہے

تم کون ہو جو رونے رلانے پہ تلے ہو
ہم کو تو فقط ہنسنے ہنسانے کا پتہ ہے

مٹی کی محبت انہیں معلوم ہے گوہر
وہ لوگ جنھیں پیڑ لگانے کا پتہ ہے

✦✦✦

سعید شارق

اسلام آباد

دُنیا خرید سکتا ہوں اس دس کے نوٹ سے
ہاتھ آیا ہے جو باپ کے بوسیدہ کوٹ سے

آسان کب رہی ہے مجھے سیرِ باغِ ہست
ہر روز لڑکھڑاتا ہوں نادیدہ چوٹ سے

ساحل پہ محوِ رقص ہیں دوشیزگانِ شب
اک چاند آنے والا ہے فردا کی بوٹ سے

آیا مہینوں بعد کوئی دوست میرے گھر
تنہائی جھانکنے لگی پردے کی اوٹ سے

دیوارِ جاں پہ اور بھی کرنا پڑے گا رنگ
یہ داغ جانے والے نہیں پہلے کوٹ سے

آئی قرارداد، عدمِ اعتماد کی
میرے خلاف وہ بھی مرے اپنے ووٹ سے

ہر بار مُنہ چڑاتا ہے تقدیر کا بٹن
ہم کنٹرول ہوتے ہیں کیسے ریموٹ سے

مجھ سے بساطِ دہر پہ چھکا نہ لگ سکا
نظریں چُراتا پھرتا ہوں میں اپنی گوٹ سے

✦✦✦

فروغ ادب کے لیے وقف
بہ یاد: سید قاسم محمود
ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور
bookdigest@hotmail.com
ISSN 2079-4584
مدیر اعلیٰ: اظہر سلیم مجوکہ
mazharmajoka@yahoo.com
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
azharmajoka@yahoo.com
برائے خط و کتاب/ترسیل زر
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0333-4377794

سپاہی سے ڈپٹی کمشنر تک (تصنیف عبدالغفور چودھری)

لیاقت بلوچ (نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان)

جناب علامہ عبدالستار عاصم صاحب (قلم فاؤنڈیشن) منصورہ تشریف لائے ان کے ساتھ بہت ہی معزز سنجیدہ خوش لباس شخصیت بھی تھی، فوری طور پر میں پہچان نہ پایا اور ان کی شکل وشبہات پر اس گمان میں رہا کہ یہ سعودی عرب کے رضی ولی صاحب ہیں لیکن مزید خیال کیا نہیں اُن سے تو طویل مدت کی شناسائی ہے یہ وہ تو نہیں، علامہ عبدالستار عاصم صاحب نے چند لمحوں کے بعد تعارف کرایا یہ عبدالغفور چوہدری صاحب (ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر) ہیں اور ساتھ ہی ان کی کتاب سپاہی سے ڈپٹی کمشنر تک تھمادی، علامہ صاحب بھی کمال کے آدمی ہیں روزانہ کی بنیاد پر کتاب شائع کرتے ہیں، منظر عام پر لاتے اور خود ہی اُسی محنت کے ساتھ اس کی پروموشن بھی کرتے ہیں، جناب عبدالغفور چودھری صاحب سے تعارف اور کتاب کی اشاعت، ترتیب وتصنیف پر بات ہوئی اور اسی دوران کتاب کی ورق گردانی بھی کی، موضوعات، عنوانات نے فوری طور پر پڑھنے کی کشش پیدا کی۔ یوں، ابتدائی علیک سلیک اور تبادلہ خیال کے بعد نشست تو ختم ہوگئی لیکن عبدالغفور چودھری صاحب کی شخصیت اور سنجیدگی پر کتاب کے عنوان سپاہی سے ڈپٹی کمشنر تک نے دل ودماغ میں تازگی پیدا کردی اور یہ ہی ارادہ کیا کہ اس کتاب پر ضرور کچھ لکھوں گا پھر علامہ عبدالستار صاحب کا پُرمحبت تعاقب بھی کچھ کرنے کچھ لکھنے پر آمادہ کردیتا ہے۔ کتاب کی مکمل تحریر بہت شاندار ہے، اور واقعات اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں، ہر اعتبار سے کتاب سپاہی سے ڈپٹی کمشنر تک ہر اُس فرد کے لیے شاندار رہنما کتاب ہے جو بھی بے سروسامانی میں زندگی کی دوڑ میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہے، وہ نیک نیتی، وژن، اہداف کے حصول اور دیانت، امانت، جوش و جذبہ سے ہر محاذ پر فرض کی ادائیگی کرے تو اسے اللہ کی مدد بھی حاصل ہوگی۔ عبدالغفور چودھری صاحب کی صبر، استقامت، امانت ودیانت، فرض کی ادائیگی میں ہر خطرہ مول لے کر اپنی زندگی میں رحمت ونصرت کے جو معجزات سمیٹے یہ کتاب انہی معجزات کی کیفیت کا ثبوت ہے۔

کامیابی محنت کا دوسرا نام ہے۔ ہر کامیابی کا کھرا محنت کے گھر سے ہو کر نکلتا ہے۔ جو شخص محنت سے جی چُراتا ہے وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ دُنیا میں جتنے بھی نامور انسان اُمر ہو کر آج لوگوں کے دِلوں پر راج کررہے ہیں اُن سب نے محنت اور اَنتھک محنت کو ہی اپنا شعار اور اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے بنی نوع انسانی کی خدمت کا فریضہ ادا کر کے ثابت کیا کہ دُنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں، اگر کوئی شخص کچھ کر گزرنے کا ارادہ مصمم کرلے، اس کے لیے نیک نیتی کیساتھ محنت کرے اور خالق کائنات کی مدد اور نصرت اُس کے شاملِ حال رہے تو ناممکنات بھی ممکنات میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں۔ محنت کی برکات سے متعلق برصغیر کے نامور شاعر ونثر نگار مولانا الطاف حسین حالؔی نے کیا خوب کہا تھا کہ

مشقت کی ذِلّت جنہوں نے اُٹھائی
جہاں میں مِلی آخر اُن کو بڑائی
کسی نے بغیر اِس کے ہرگز نہ پائی
فضیلت نہ عزت نہ فرماں روائی

محنت کی عظمت کی ساری دُنیا قائل ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض لوگوں کو اُس کی محنت کا ثمر اس دُنیا میں ہی مِل جاتا ہے اور بعض لوگ دُنیا میں اس سے محروم ہی رہتے ہیں، چاہے جتنے بھی مخلص ہوں۔ اس کی کئی ایک سماجی وجوہات ہوتی ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع تو نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ضرور ہے لیکن اندھیر نہیں، جو کسی بھی وجہ سے دُنیا میں اپنی محنت کا پھل حاصل نہیں کرپاتے، اگر وہ خالق کائنات اللہ وحدہٗ لاشریک اور محسنِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ؐ پر ایمان رکھتا ہے، مسلمان ہے تو اُن کے لیے اللہ نے آخرت میں ایسی نعمتیں رکھی ہیں جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں اور کسی دِل پر اُن کا خیال تک نہ آیا۔ اللہ ہر مومن مسلمان کو ایسی لازوال نعمتیں نصیب کرے (آمین!)

افواجِ پاکستان کے سب سے نچلے عہدہ سپاہی پر بھرتی ہونے والا ایک نوجوان محنت اور مشقت کو شعار بنا کر ترقی کی منازل طے کرتا کرتا حکومتِ پنجاب کے اعلیٰ ترین عہدہ یعنی ڈپٹی کمشنر تک کیسے پہنچا، یہ ہے وہ داستانِ حیات جو پی ایس سی آفیسر عبدالغفور چودھری، ڈپٹی کمشنر (ریٹائرڈ نے اپنی اِس خودنوشت سوانح حیات سپاہی سے ڈپٹی کمشنر تک میں بیان کی ہے، جس کی ایک ایک سطر قارئین کے لیے دلچسپی، معلومات اور تجسّس سے بھرپور ہے، بالخصوص اُن نوجوانوں کے لیے جو بقول اقبالؔ ستاروں پہ کمند ڈالتے ہیں، اور جن سے اِسی وصف کی بناء پر اقبالؔ کو محبت بھی ہے۔ یہ کتاب بطور خاص اُن نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے جو مالی پریشانیوں کے باعث پہلے تو بمشکل اعلیٰ تعلیم کی منازل طے کرپاتے ہیں اور پھر ملکی معاشی صورتِ حال اور حکمرانوں، بیوروکریسی کی کرپشن، اقرباء پروری کے باعث بے پناہ کوشش کے باوجود سرکاری ملازمت کے حصول میں ناکام رہتے ہیں اور مایوس ہوکر یا تو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار ڈھابہ کھول کر اپنی روزی کماتے ہیں یا پھر والدین کی جمع پونجی انسانی اسمگلروں کے ہاتھوں قربان کر کے اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے بیرونِ ملک ملازمت کے لیے غیرقانونی طریقے سے سفر کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور کوئی خوش نصیب ہی اُن میں سے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو پاتا ہے ورنہ تو سمندر کی بے

رحم موجوں یا انہی انسانی اسمگلروں کی دھوکہ دہی کا شکار ہوکر والدین کی جمع پونجی سمیت اپنی جان بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ اس میں اصل قصور تو بہر حال اُن محرومیوں کا ہی ہے جو پے در پے حکومتوں کی نااہلیوں کے باعث وطن کے اِن باصلاحیت مگر توجہ اور حق سے محروم تعلیم یافتہ اور ہنر مند نوجوانوں کا مقدر بن کر انہیں اِس کٹھن اور غیر قانونی راستہ کو اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ بہر کیف نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ مایوسی کی راہ پر چلنے کی بجائے نیک نیتی، خلوص، محنت، لگن اور جوش و جذبہ کو اپنا شعار بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ سُرخرو ہوکر اپنے لیے معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ وطنِ عزیز کے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور اُنہیں معاشرے میں جائز مقام دینے کے لیے حکمرانوں سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

نوجوانوں کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کامیابی غیبی طور پر گر کر جھولی میں نہیں آتی بلکہ کامیابی کے لیے جہاں مسلسل لگن اور محنت درکار ہوتی ہے وہاں والدین کی خدمت، بزرگوں کی اطاعت، سچائی اور دیانت داری اور سب سے بڑھ کر طاعتِ خدا ور طاعتِ رسول ؟ کو زندگی کا شعار بنالینے سے ہی کامیابی قدم چومتی ہے۔ دُعا مومن کا ہتھیار ہے، صبر اور نماز سے اللہ کی غیبی مدد آتی ہے۔ غریبوں، مسکینوں، بے سہارا اور ضرورت مند لوگوں کی مدد کرنے سے اللہ کی رحمت کے دروازے کھلتے ہیں۔ صدقہ بلاؤں سے حفاظت کے لیے ڈھال ہے۔ ایک حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ صدقہ کو نہ چھوڑو، خواہ تم کنجوس ہی کیوں نہ ہو۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، مفہوم بیشک ! تمہارے لیے رسول اللہ ؟ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ (الاحزاب:)

کتاب ہذا میں مصنف کی پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز یعنی بطور سپاہی پاک فوج میں بھرتی سے لے کر ریٹائرمنٹ یعنی بطور ڈپٹی کمشنر ریٹائرمنٹ تک کے حالات وواقعات اور مشاہدات وتجربات کا نچوڑ موجود ہے، جو کہ سروس میں آنے کے خواہش مند افراد کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

کتاب کے مصنف نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو اپنی اس سوانح عمری کا حصہ بنایا ہے، سی ایس ایس اور پی ایم ایس دونوں امتحانات میں شمولیت کی، ناکام بھی ہوئے لیکن انہوں نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور بالآخر کامیابی نے اُن کے قدم چومے۔ مزید محنت کی اور اللہ کے فضل وکرم سے کامیابی کی منازل طے کرتے کرتے سول سروس کے اعلیٰ ترین عہدوں میں سے ایک تک پہنچے اور کامیابی کیساتھ اپنی سروس مکمل کرکے ریٹائر ہوگئے، اگر چہ اس دوران اپنی امانت ودیانت اور اُصول پسندی پر مبنی طرزِ عمل کی وجہ سے کرپٹ عناصر کی عداوت کا شکار ہوکر نیب کے زیرِ عتاب بھی رہے لیکن بعد ازاں باعزت رہا ہوکر دوبارہ اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا اور ریٹائرمنٹ تک بطور ڈپٹی کمشنر کام کرتے رہے۔

کتاب کے آخر میں سی ایس ایس اور پی ایم ایس کے امتحانات میں شرکت کے خواہش مند طلباء و طالبات کی راہنمائی کے لیے خصوصی طور پر ایک باب کا اضافہ کیا گیا ہے، جس میں مضامین کے چناؤ سے لے کر امتحانی پرچہ جات حل کرنے تک راہنمائی شامل ہے، جو راقم کے عملی تجربے کا نچوڑ ہے۔ اس باب کے مطالعے سے سی ایس ایس یا پی ایم ایس کے امتحانات میں شرکت کے خواہش مند طلباء وطالبات کی بہت سی اُلجھنیں دُور ہوجائیں گی اور اُنہیں مہنگی اکیڈمیوں کے جھنجھٹ سے بھی نجات ملے گی، نیز مذکورہ مقابلے کے امتحانات کے حوالے سے اُن کے علم میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہوگا۔

چونکہ قانون کی ڈگری بھی رکھتے ہیں اس لیے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے وکالت کے شعبے میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا اور ہائی کورٹ میں بطور اٹارنی ایٹ لا کی پریکٹس کا لائسنس حاصل کرکے اے جی سی لاء فرم کے نام سے قانونی معاونت پر مبنی فرم کی بنیاد رکھی، جس میں سائلین کو قانونی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ عبدالغفور چودھری صاحب کو تعلیم وتعلم سے بھی خصوصی شغف ہے۔ اسلامیات، پولیٹیکل سائنس اور انگریزی میں ماسٹرز اور ساتھ بی ایڈ، ایل ایل بی کی ڈگریاں بھی حاصل کررکھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سروس کے دوران ہی ء میں دی سٹی ماڈل اسکولز اینڈ کالج کے نام سے ایک مثالی تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھ دی تھی۔ علاوہ ازیں گزدا چج کے نام سے روزنامہ پاکستان اور دیگر قومی اخبارات کے لیے باقاعدگی سے کالم بھی لکھتے ہیں۔

پانچ سو اُنسٹھ صفحات پر مشتمل عبدالغفور چودھری صاحب کی خودنوشت داستانِ حیات سپاہی سے ڈپٹی کمشنر تک سول سروس اور اس سے وابستہ ذاتی واقعات وتجربات پر مبنی ایک دلچسپ، معلومات افزاء اور چشم کشا دستاویز ہے، جس میں وطنِ عزیز کے اندر پائی جانے والی گورننس کی خامیوں، سرکاری اداروں میں بے جا سیاسی مداخلت، اقتدار کے ایوانوں اور سول بیوروکریسی کے درمیان اختیارات کے استعمال سے متعلق رسہ کشی اور بحیثیت مجموعی بیوروکریسی، سیاستدانوں اور عامۃ الناس کے مابین آئے روز پیش آمدہ معاملات، مصائب ومشکلات کی نہایت اچھے پیرائے میں منظرکشی کی گئی ہے اور اُن کے حل کے حوالے سے گائیڈ لائن دی گئی ہے۔ سول سروس میں پیشہ ورانہ خدمات انجام دینے والے نوجوان، قومی سیاست سے وابستہ افراد، صحافی، دانشور، تجزیہ نگار، دفاعی ماہرین، عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ سے وابستہ افسران واہلکاران، طلبہ وطالبات سمیت عامۃ الناس کے لیے کتابِ ہذا بیش قدر، مفید اور معلومات افزاء تحفے سے کم نہیں۔ کتاب کے اوّل وآخر میں معروف صحافی، دانشور وتجزیہ نگار جناب مجیب الرحمٰن شامی صاحب کا تبصرہ کتاب کی رونق کو دوچند کرنے کا باعث ہے۔ خوبصورت و دیدہ زیب طباعت پر مصنف اور ناشرین کو مبارکباد اور تحسین پیش کرتا ہوں۔

لفظ ''خانہ پوری'' اور ''دن بہ دن'' میں کیا غلطی ہے؟

اطہر ہاشمی

ہم کیا اور ہماری بساط کیا، بڑوں کی غلطیاں پکڑ کر بڑا بننے کا شوق ہے۔ لیکن بڑوں کی غلطی چھوٹوں کے لیے سند بن جاتی ہے۔

ہمارے کچھ ساتھی تواتر سے خانہ پوری لکھتے ہیں۔ نظر پڑ جائے تو ٹھیک کروا دیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک نوجوان ساتھی جمعہ 11 اکتوبر کا جسارت لے کر بیٹھ گئے جس کے ادارتی صفحے پر ایک بہت بڑے کالم نگار نے اپنے مضمون میں کئی جگہ خانہ پوری لکھا ہے، اور یہ کمپوزنگ کی غلطی بھی نہیں ہے۔ ان کے لکھے کو مستند قرار نہیں دیا جاسکتا۔

نوجوان ساتھیوں میں سے جب کوئی خانہ پوری لکھتا ہے تو ہم اس سے یہ ضرور پوچھتے ہیں کہ پوری کے ساتھ حلوہ کہاں ہے، کہ پوری کے ذکر پر حلوہ ہی یاد آتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ پُری ہے یعنی خانہ پُری۔ مطلب ہے نقشہ بھرنا، جگہ بھرنا وغیرہ۔ پُر کرنے کا مطلب تو معلوم ہی ہے، اسی سے پُری ہے (پ پر پیش، ورنہ پری بن کر اُڑ جائے گی)۔ فارم پُر کیے جاتے ہیں جن سے سبھی کو واسطہ پڑتا ہے۔ پُر پر خوامخواہ ایک شعر یاد آ گیا:

پُر ہوں میں درد سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ممکن ہے پہلے مصرع میں کچھ گڑبڑ ہو، کوئی صاحب چاہیں تو تصحیح کر سکتے ہیں۔ پُر، خالی کا مقابل ہے۔ چنانچہ جو خانے خالی ہوں انہیں پُر کیا جائے تو خانہ پُری کہلائے گا۔

بطور سابقہ پُر کئی الفاظ میں شامل ہے جیسے پُرآب، پُرمغز، پُرپیچ، پُرشکم وغیرہ۔ پُر فارسی کا ہے اور خانہ بھی۔ پُر ہندی میں چمڑے کے اس بڑے ڈول کو کہتے ہیں جس سے کنویں سے پانی نکال کر آبپاشی کی جائے۔

جسارت ہی کے ایک کالم نگار نے لکھا ہے ورطہ حیرت سے عدالتوں کو دیکھتا انصاف۔ صاف ظاہر ہے کہ موصوف کو ورطہ کا مطلب نہیں معلوم، اور معلوم کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ بس جملے کو بارعب بنانے کے لیے ورطہ پکڑ لائے۔

ورطہ حیرت تک تو صحیح ہے، لیکن ورطہ عدالتوں کو دیکھتا ہے نہ انصاف کو، بلکہ کسی کو بھی نہیں دیکھتا۔ ورطہ کا مطلب ہے ہلاکت کا مقام، ایسی زمین جہاں رستہ نہ ہو۔ مجاز اً بھنور یا پانی کے چکر اور گرداب کو کہتے ہیں۔ جو مستعمل ہے وہ ہے ورطہ حیرت میں ڈوب جانا۔ یعنی حیرت بھنور میں پھنس کر غوطے کھانے لگی۔

ایک بڑا دلچسپ املا شائع ہو رہا ہے اور کچھ لوگوں کی زبان پر بھی ہے۔ یعنی املا اور تلفظ دونوں ہی مزے کے ہیں۔ یہ لفظ ہے ہراول۔ کئی اخبارات میں اسے تشدید کے ساتھ لکھا جا رہا ہے یعنی ہر۔ اوّل۔ کچھ ٹی وی چینلز پر بھی اسی طرح سننے میں آ رہا ہے۔ صحافی بھائی سے پوچھو تو وہ بڑے وثوق سے کہتا ہے کہ یہ ہر اوّل ہے۔ چلیے اوّل تو سمجھ میں آ گیا، پھر یہ ہر کیا ہے؟ کیا یہ انگریزی کا HER ہے یا سنسکرت کا ہر۔

ہندوؤں کے نزدیک اس کا مطلب وشنو، کرشن، مہادیو وغیرہ ہے۔ ہر بھجن کا مطلب ہے وشنو کی عبادت۔ یہ ہر فارسی میں بھی ہے اور اردو میں عام ہے۔ جیسے ہر دفعہ، ہر بار، ہر گھڑی۔ اہل زبان یہ لفظ جمع کے ساتھ استعمال نہیں کرتے۔ جیسے ہر لوگ، ہر ممالک، یہ غلط ہے۔ ناسخ کا مصرع ہے

ہیں حسیں اور بھی پر تجھ میں ہے ہر بات نئی

احمد فراز کا شعر ہے:

بیاں ہر ایک سے دل کی حالتیں کرنی
فراز تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی

بہر حال ہراول ایک ہی لفظ ہے اور بغیر کسی تشدد کے (ہرا۔ ول)۔ اس کا مطلب ہے وہ تھوڑی فوج جو لشکر کے آگے چلے، لشکر کا پیش خیمہ۔

اسلام آباد سے شائع ہونے والا اخبار اردو زبان، اردو کے حوالے سے ایک معتبر رسالہ ہے جو ادارہ فروغِ قومی زبان کے تحت شائع ہوتا ہے اور فروغِ قومی زبان میں حصہ لے رہا ہے۔ اس کے شمارے (اگست 2019ء) میں داود کیف کا مضمون اردو اور بلوچی کا سنگم نہ صرف دلچسپ ہے، بلکہ اس میں یہ سبق بھی ہے کہ مقامی زبانوں کو بھی اردو میں شامل کیا جائے۔

اردو تو ویسے بھی مختلف زبانوں کی آمیزش سے وجود میں آئی ہے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ اب تو انگریزی کے الفاظ بے تحاشا جگہ پا رہے ہیں بلکہ ٹھونسے جا رہے ہیں۔ انگریزی کے وہ الفاظ جو اردو میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں اور اب زبان کا حصہ بن گئے ہیں ان کو ترک کرنے یا متبادل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم جن انگریزی الفاظ کا متبادل اردو میں موجود ہے اسے ترک نہیں کرنا چاہیے۔

مثلاً ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ممبران بے معنی ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے۔ جب کہ ارکان یا اراکین سامنے کے الفاظ ہیں۔ ممبران تو آدھا تیتر، آدھا بٹیر ہے۔ جج کا لفظ اردو میں قدم جما چکا ہے، لیکن اخبارات میں خاص طور پر سرخیوں میں اس کی جمع ججز لکھنا غلط ہے۔ اس کی جگہ ججوں لکھنا چاہیے، اور جج بھی بطور جمع استعمال ہوسکتا ہے۔ مثلاً تمام جج حاضر تھے۔

پارلیمنٹ انگریزی کا لفظ ہے لیکن اسے پارلیمان لکھا جائے تو یہ اپنا ہو جائے گا۔ داود کیف نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ جہاں تک اردو ذخیرہ الفاظ کا تعلق ہے تو اس میں علاقائی زبانوں کے الفاظ عام لوگوں کے میل جول کے قدرتی نتیجے ہی کی بدولت شامل ہو رہے ہیں (اردو بھی اسی طرح وجود میں آئی ہے) جب کہ ان میں ہم آہنگی اور اردو کی لغت میں اضافے کی شعوری کوششیں کم ہی کی گئی ہیں۔ البتہ ایک بات ضرور حوصلہ افزا ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں کے رہنے والے ادیبوں نے جب ایک مخصوص دیہی ماحول اور خالص علاقائی فضا سے عام معاشرتی موضوع چن کر کوئی افسانہ یا ناول لکھا ہے تو اس سے قومی کلچر کی تصویر میں خوبصورت رنگوں کا اضافہ بھی ہوتا رہا ہے۔

علاقائی زبانوں کو اردو میں شامل کرنے کا مشورہ صائب ہے اور اس پر بڑی حد تک عمل بھی ہو رہا ہے، تاہم بلوچی زبان اس عمل سے دُور ہے۔ البتہ پنجابی کے ادیب بلاتکلف پنجابی کے الفاظ اردو افسانوں، ناولوں میں شامل کر رہے ہیں۔ ان میں نمایاں مثال اشفاق احمد (مرحوم) کی ہے۔ سندھ میں سندھی کے الفاظ بھی اردو بولنے والوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں، لیکن اس عمل سے کراچی بڑی حد تک باہر ہے۔

اصول یہ ہے کہ اقلیت اکثریت کی زبان استعمال کرتی ہے۔ کراچی میں عام لوگوں کا واسطہ زبان کی حد تک سندھی بولنے والوں سے نہیں پڑتا۔ پنگا، پھڈا وغیرہ جیسے الفاظ اردو میں باہر سے آئے ہیں۔ کس زبان سے؟ یہ واضح نہیں ہے۔ پھڈا پنجاب میں نہیں بولا جاتا۔ یہ لفظ کراچی کا خاص ہے۔ گڑھا کی جگہ کھڈا بھی پنجاب سے آیا ہے۔ ملتان میں ایک محلّہ گوجر کھڈا ہے، گو کہ اب تو ملتان میں بھی قدم قدم پر کھڈے ہیں۔

اسی شمارے میں جامعہ آزاد جموں و کشمیر کے اردو لیکچرار فرہاد احمد فگار کا مضمون ہے، جنہوں نے غلط العوام الفاظ اور املا کی نہر نکالی ہے۔ ان کا ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے قریب المرگ۔ اس کا استعمال عام ہے لیکن قواعد کی رو سے یہ ترکیب درست نہیں، کیونکہ قریب اور مرگ دونوں فارسی کے الفاظ ہیں، جب کہ ال عربی ہے، اس لیے اس کی ترکیب نہیں بنے گی۔ چنانچہ قریب المرگ کے بجائے قریب مرگ یا پھر قریب الموت ٹھیک اصطلاح ہوگی۔

لیکن کیا قریب فارسی کا لفظ ہے؟ ہم تو اسے عربی کا سمجھتے رہے۔ قریب کا مصدر قرب ہے اور یہ عربی کا لفظ ہے۔ اسی سے قربت، اقرباء وغیرہ ہے۔ قربان کا مطلب بھی خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے کسی شے کی قربانی دینا ہے۔ اردو کے استاد فرہاد احمد فگار نے جانے کس خیال میں قریب کو فارسی لفظ قرار دے دیا۔

ابوالکلام آزاد نے ایک بڑے شاعر اور ادیب اختر الایمان کے نام پر اسی ال کی وجہ سے اعتراض کیا تھا کہ اختر فارسی کا لفظ ہے اور ایمان عربی کا۔ لیکن اختر الایمان نے اپنا نام نہیں بدلا۔ مگر زیب النساء کا کیا کیا جائے۔ بادشاہ اورنگ زیب خود بھی عالم تھے اور ان کی بیٹی زیب النساء بھی عالم، فاضل تھیں۔ لیکن زیب فارسی کا لفظ ہے اور نساء عربی کا۔ پھر یہ نام کیوں رکھا گیا؟ ال کے بغیر زیب نساء بھی تو چل سکتا تھا۔

کراچی کے صدر بازار میں ایک معروف سڑک کا نام بھی زیب النساء اسٹریٹ ہے۔ اس پر نہ تو ابوالکلام آزاد نے اعتراض کیا اور نہ ہی استاد فرہاد احمد فگار کو کوئی اعتراض ہے۔ بہرحال فرہاد صاحب کا مضمون اصلاح کی اچھی کوشش ہے جو جاری رہنی چاہیے۔ اس مضمون سے مزید استفادہ کیا جائے گا، گو کہ بیشتر باتیں وہ ہیں جن کی ہم بار بار نشاندہی کر چکے ہیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ قریب المرگ جیسے علمی اعتراض سے اردو کا دامن تنگ ہوگا۔ دن بہ دن لکھنا قواعد کے اعتبار سے غلط ہے کہ دن ہندی کا لفظ ہے اور اس میں بہ نہیں آئے گی، چنانچہ یا تو دن پر دن لکھا جائے یا روز بروز۔ مگر ہم پھر یہی کہیں گے کہ اردو میں اگر دن بہ دن آ ہی گیا ہے تو اسے کیوں باہر نکالا جائے۔ ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

بلونت سنگھ کے شاہکار افسانے

دانیال حسن چغتائی

پریم چند کی افسانہ نگاری کی کئی خوبیاں ہیں۔ ان کا شمار اردو کے بنیاد گزار افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے بلکہ انھوں نے بہت سے موضوعات پر سب سے پہلے افسانے تحریر کیے ہیں، جن میں ایک اہم اور خاص موضوع دیہات بھی ہے۔ دیہات کے موضوع پر افسانے لکھنے کی روایت پریم چند سے شروع ہوئی۔ پریم چند کے بعد دیہات کے موضوع پر ان کے بعد والوں نے بھی طبع آزمائی کی اور بعد کی نسل میں سے بھی کئی نامور افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ بلونت سنگھ کا شمار بھی ان ہی چند خاص افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے پریم چند کی اس روایت کو آگے بڑھایا۔ بلونت سنگھ نے پریم چند کی طرح دیہات کو کھلے دل سے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ ان کے افسانوں میں نہ صرف دیہات کی خوبصورتی کے نقوش دکھائی دیتے ہیں بلکہ دیہات کی اندرونی کیفیت کو جیسے انھوں نے محسوس کیا، ٹھیک اسی شکل وصورت میں اس کو اپنے افسانوں میں بیان کر دیا۔ اردو کے دیگر دیہی افسانہ نگاروں کی طرح انھوں نے بھی اپنے آبائی علاقے کے دیہات کا ذکر اپنے افسانوں میں کیا ہے۔ بلونت سنگھ کا آبائی علاقہ سرزمین پنجاب ہے۔ لہٰذا ان کے دیہی افسانوں میں ہر طرف پنجاب ہی پنجاب نظر آتا ہے۔ پنجاب کے دیہات پر ان کے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی افسانے لکھے ہیں لیکن جس انداز اور جس ہنرمندی کے ساتھ انھوں نے پنجاب کے دیہات کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے وہ دوسروں کے ہاں نہیں ہے۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کا ایک الگ رنگ دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔

اکیس افسانوں کے اس مجموعے میں ان کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے جو شہری زندگی سے متعلق ہیں۔ یہ عام چھوٹے موٹے انسانوں کی کہانیاں ہیں جو بلونت سنگھ کی فنکاری کی یک جہت ہونے کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں سیدھے سادے انسانوں میں کچھ خصائص یا کوئی پہلو ایسا دکھایا گیا ہے کہ ان کی عمومیت خصوصیت میں بدل گئی ہے۔ پہلے حصے میں ان کہانیوں کا ذکر ہے جن میں شہری زندگی کے سامنے کے کردار ہیں جن میں کوئی نہ کوئی خاص نکتہ ہے۔ دوسرے حصے میں ان کہانیوں کو لیا گیا ہے جن کا موضوع خواہ کچھ ہو، ان کے بین السطور سے کھلتا ہے کہ ان کا حادی محرک شہوتی جذبہ ہے۔

گمراہ بارہ تیرہ برس کے لڑکے کی کہانی ہے جو اکثر کلاس سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کا ٹیچر باپ سے شکایت کرتا ہے کہ تمہارا بیٹا گم راہ ہو رہا ہے۔ فکر مند باپ اگلے دن چپکے چپکے بیٹے کا تعاقب کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ بیٹا بازی گروں کا تماشا دیکھنے کے بعد سپیروں کا کھیل دیکھتا ہے، پھر پہاڑی ندی پار کر کے چائے کے باغات میں جا نکلتا ہے جہاں سے آگے برف پوش چوٹیوں کا نیلگوں غبار چھایا ہوا ہے۔ باپ کو محسوس ہوتا ہے کہ دفتری معمولات اور کاروباری زندگی میں گھرے ہونے کی وجہ سے زندگی اور اس کی فطری رو سے وہ کٹ چکا تھا، زندگی کی یکسانیت یا کاروباری بھاگ دوڑ میں فطرت یا زندگی کے لطف و مسرت سے ہمارا جو رشتہ ٹوٹ جاتا ہے یہ کہانی اس معنویت کو نہایت چابکدستی سے ابھارتی ہے۔

نہال چند بھی مزے کی کہانی ہے جس میں نہال چند کی موٹی اور بے ریا شخصیت دل جیت لیتی ہے، اس کی زندہ دلی بہت متاثر کن ہے۔ زندگی کے گرم و سرد سے بے نیاز گزرنے اور معمولات کو موج مستی میں نبھانے اور خوش باش رہنے والا فوٹو گرافر نہال چند معمولی آدمی ہے، لیکن اس کی خوش طبعی اس کو دلچسپ اور یادگار بنا دیتی ہے۔ یہ کہانی خوش طبعی اور خوش باشی کو بلونت سنگھ کا خراج تحسین ہے۔

خوددار بھی اسی نوع کی چھوٹی سی کہانی ہے، یہ عام انسان کے کسی غیر عام پہلو کی کہانی ہے۔ نہال چند میں جس طرح توجہ طلب خوش طبعی تھی، یہاں مسئلہ خودداری کا ہے یا اس رویے کا جو خودداری کو ڈھال بناتا ہے۔

ایسی کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلونت سنگھ انسانی نفسیات کی باریکیوں میں اترنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ بیانیہ کو وضع کرتے ہوئے اور کرداروں کو تراشتے ہوئے بلونت سنگھ نے انسانی نفسیات کو کبھی نظرانداز نہیں کیا، اور کہیں کہیں تو ایسا نکتہ پیدا کیا ہے کہ روزمرہ کی بے کیف اور روٹین زندگی میں کوئی ایسا پہلو سامنے آ گیا ہے، یا کوئی معنویت ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ نہ صرف کہانی دلچسپ ہو گئی ہے بلکہ کردار بھی یادگار ہو گیا ہے۔

اسی طرح کچھ کہانیاں ایسی ہیں جن کا محرک نفسانی جذبہ یا اس کا فقدان یا اس کی عدم تکمیل کا احساس ہے۔ اس مجموعے میں ایسی پانچ کہانیاں قابل

ذکر ہیں، پیپرویٹ، سمجھوتہ، دیمک، کٹھن ڈگری اور سورما سنگھ ان میں شامل ہیں۔ اس نوع کی زیادہ تر کہانیاں شہری زندگی بلکہ متوسط یا نچلے متوسط طبقے کی شہری زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ متوسط طبقے کی مخصوص ملمع سازی کے پیش نظر گفتگو بہت معنی خیز ہے۔ ان میں سے صرف ایک کہانی سورما سنگھ سکھ ثقافت میں رچی بسی ہے باقی کہانیاں عمومی معاشرتی نوعیت کی ہیں۔

پیپرویٹ " سمجھوتہ اور 'دیمک روزمرہ زندگی کی دلچسپ کہانیاں ہیں۔ پیپرویٹ میں ایک نوجوان جوڑا ہے۔ شوہر کو نوجوان بیوی کی اس بات سے چڑ ہے کہ اس کے دفتر چلے جانے کے بعد اس کی خوبصورت بیوی کھڑکی کھول کر نہ بیٹھا کرے کہ سامنے کے فلیٹ میں کالج کے لڑکے تاکتے ہیں۔ نئی نئی شادی کے بعد عورت مرد کے جذبات میں جو اتار چڑھاؤ آتے ہیں، مرد جس طرح عورت پر تصرف جمانا چاہتا ہے یا بات بات پر شک وشبہ کا شکار ہوتا ہے، یا خود اعتمادی کی کمی یا احساس کم تری کی بنا پر کھسیانا پن کا مظاہرہ کرتا ہے اور عورت اکثر و بیشتر ایک پُرسکون اعتماد سے اس کی جھیلتی اور سلجھاتی ہے، یہ چھوٹی سی کہانی اس کی خوبصورت تمثیل ہے۔

سمجھوتہ اور دیمک بھی اس نوع کی دلچسپ کہانیاں ہیں۔ سمجھوتہ میں ایک میاں بیوی جس فلیٹ میں منتقل ہوتے ہیں، وہیں سامنے ہی کچھ شوخ نوجوان طلبا رہتے ہیں۔ فلیٹ کی نشست اس طرح کی ہے بیوی لاکھ بچنے کی کوشش کرے، گھر کا کام کاج کرتے ہوئے وہ لڑکوں کی نگاہ میں رہتی ہے اور جب جب لڑکوں کو موقع ملتا ہے وہ چہلیں کرتے ہیں، جملے چست کرتے ہیں اور کبھی کبھی ایک آدھ گانے کا بول بھی ہو جاتا ہے۔ تنگ آ کر بالآخر وہ عورت ایک دن لڑکوں کو سخت سست سناتی ہے۔ اس دن کے بعد پڑوس میں مردنی چھا جاتی ہے، سب شوخی، خوش وقتی غائب ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ خود عورت کی طبیعت الجھنے لگتی ہے، اسے عجیب کمی سی محسوس ہوتی ہے، گویا اس کی کشش ختم ہوگئی یا وہ بوڑھی ہوگئی ہو۔ چنانچہ وہ میاں سے کہتی ہے، گھر بدل لیں، میں یہاں نہیں رہ سکتی۔

دیمک مین ادھیڑ عمر کی جس نفسی بے کیفی اور یکسانیت کا فقط سرسری بیان ہے، کٹھن ڈگری میں وہ بھرپور معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہے اور پرت در پرت کئی گرہیں کھولتی ہے۔ یہ ایک طرح سے نسوانیت کی کہانی بھی ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عامل مرد ہے، لیکن عامل عورت بھی ہے۔ یکسانیت اور معمولات زندگی کا روٹین جو مرد کے جذبات کو کند کر دیتا ہے، فقط مرد ہی کا مسئلہ نہیں، عورت کا مسئلہ بھی ہے۔ اصل معاملہ کلچر کا ہے جو ذکر مرکزیت پر مبنی ہے، اس لیے نفسانی زندگی کا عامل مرد کو تسلیم کر لیا گیا ہے ورنہ عورت بھی عامل ہے۔ ضروری نہیں کہ بلونت سنگھ نے اسے نسوایت کے نقطہ نظر ہی سے لکھا ہو۔ اس نے تو اپنی فنکارانہ بصیرت کی روشنی میں بیانیہ تشکیل دیا۔ لیکن چونکہ عورت کے جذبات سے بھی اس میں انصاف کیا گیا ہے تو یہ برابر کا سلسلہ بن گیا۔

اکیس افسانوں میں ہر ایک پر تبصرہ کیا جائے تو یہ پورا طویل مقالہ بن جائے گا۔ اسی لیے مخصوص کہانیوں پر ہی اکتفا کیا ہے اور بھائی حسن مختار کا بھی بہت شکریہ کہ ان کی وجہ سے مجھے اردو کلاسک کی خوبصورت کتاب پڑھنے کو ملی۔ کتاب دوستی سلامت رہے۔

تاثیر جعفری

دشت کا منظر بنا، تصویر میں
پھر کوئی اک ڈر بنا، تصویر میں
آنکھ ناں ہو زخم ہو رستا ہوا
دل نہیں پتھر بنا، تصویر میں
ہجر میں جلتا دکھا، میرا بدن
یار کچھ ہٹ کر بنا، تصویر میں
اک اچھوتا رنگ بھر تو کرب کا
غم نیا یکسر بنا، تصویر میں
کر نمایاں اور کچھ چہرہ مرا
درد کچھ بہتر بنا، تصویر میں

✧✧✧

کاشف منظور

فکر کو مہمیز ہو تو خود کو قائل کیجیے
شعر کہنے ہیں تو پھر اس دل کو مائل کیجیے
میں نہ مانوں عشق ہے جھوٹا فسانہ آپ کا
پیار کرنا ہے تو پہلے مجھ کو قائل کیجیے
دل تمنا کی زباں میں کچھ تو کہہ سکتا ہے آج
پہلے اس خاموش خواہش ہی کو سائل کیجیے
اس ادا سے، ناز سے، انداز سے کچھ کام لیں
کچھ نگاہ تیز سے اس دل کو گھائل کیجیے
آخری ہے یہ محبت مانتے ہیں ہم مگر
بات کم رکھیے، فقط سچے دلائل کیجیے
بے محبت ہم کسی چہرے سے کب نسبت رکھیں
چاہے کوئی حور ہو کیسے شمائل کیجیے
کیوں بھلا کاشف ابھی اقرار الفت وہ کریں
آپ قلب وجاں کو پہلے کچھ تو گھائل کیجیے

✧✧✧

جدید اُردو شاعری میں تنہائی کا استعارہ

لبنیٰ صفدر/ لاہور

جدید اردو شاعری میں تنہائی کا استعارہ صرف ایک جذباتی کیفیت یا نفسیاتی حوالہ نہیں بلکہ ایک وسیع تاریخی، سماجی اور فکری عمل کی علامت ہے۔ تجزیاتی نقطۂ نظر سے بات کی جائے تو یہ استعارہ چار بنیادی پریکٹس میں کام کرتا ہے: پہلی وہ تنہائی جو وجودی و فلسفیانہ سوالات سے جنم لیتی ہے؛ دوسری وہ تنہائی جو معاشرتی اور سیاسی تغیرات کے نتیجے میں ادبی شعور میں داخل ہوئی؛ تیسری وہ تنہائی جو نسائی و جنسیت کے زاویے سے جڑی ہوئی ہے؛ اور چوتھی وہ تنہائی جو جدید شہری تجربہ اور جدید ٹیکنالوجی کے تناظر میں پیدا ہوئی۔ ان چار جہات کو باہم مربوط سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ جدید اردو شاعری میں تنہائی کا استعارہ عموماً انہی پیچیدہ اور متداخل حوالوں سے جڑ کر معنی بناتا ہے۔

وجودی حوالہ سے دیکھا جائے تو جدیدیت کے زوال نے جبکہ زندگی کے بیانیے میں فرد کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کیا جہاں روایتی معنوی ڈھانچے کمزور پڑ گئے۔ اس کمزوری نے شاعر کو ازسرِ نو اس مقامِ وجود سے سوال کرنے کی تحریک دی۔ جدید اردو شاعری میں اسی سوال کو تنہائی کی زبان میں ڈھالا گیا: وہ سوال کہ انسان کا وجود کس معنی میں خود کو پہچانتا ہے، اس کی وابستگیاں کہاں تک جوڑے رکھی جا سکتی ہیں، اور اس کا زمان و مکان کے ساتھ رشتہ کیسے بدل رہا ہے۔ تنہائی یہاں ایک ضمیر کا عکاس ہے جو بیرونی دنیا کے شور یا سماجی فاعلیت کے باوجود اندر کے خلاؤں کو واضح کرتا ہے۔ جب ہم کسی شاعر کے کلام میں تنہائی کا استعارہ تلاش کرتے ہیں تو ہمیں دراصل وہ اضطراب ملتا ہے جو معنویت کی تلاش، ازمیت کے سوالات، اور وجود کے عدم اطمینان سے پیدا ہوتا ہے۔ اس جہت میں تنہائی فرد کی داخلی رُغبت کا نام بنتی ہے، مگر وہ صرف ذاتی نوعیت کی تصدیق نہیں؛ یہ عالمِ انسانی کے تناظر میں ایک عمومی کیفیت کا اظہار بھی ہے۔

سماجی و سیاسی حوالوں نے جدید اردو شاعری میں تنہائی کے استعارے کو مزید تقویت دی۔ نوآبادیاتی عہد، آزادی کا المیہ، تقسیم برصغیر، اور بعد از تقسیم سماجی تبدیلیاں یہ تمام تجربات شعری شعور کو اس مقام تک لے آئے جہاں شاعر نے تنہائی کو اجتماعی شکست، بغاوت، اور انتقامی تنہائی کے روپ میں دیکھا۔ اس تنہائی میں شاعر کا فردی زخم ایک نمائندہ درد بن جاتا ہے؛ اس میں وہ شکست شامل ہوتی ہے جو قوم، زبان، یا تہذیب نے جھیلی ہوتی ہے۔ لہٰذا جدید اردو شاعری میں بعض اوقات تنہائی کا استعارہ محض ذاتی کرب نہ رہ کر اجتماعی تاریخ کا نوحہ بھی بن جاتا ہے۔ اس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ شاعر کی تنہائی اکثر احتجاج کی حامل ہوتی ہے: احتجاج اس صورت میں کہ شاعر اپنے احساسِ بے یاری کو نہ صرف ذاتی شکایت سمجھتا ہے بلکہ ایک ایسی صورتِ حال کے طور پر دیکھتا ہے جس میں سماج نے اپنے افراد کو اکیلا چھوڑ رکھا ہے۔

ایک اور کلیدی زاویہ نسوانی تجربہ ہے۔ جدید اردو شاعری میں خواتین شعرا نے جب تنہائی کا استعارہ استعمال کیا تو انہوں نے اسے محض ایک وجودی کیفیت کے بجائے طاقت، دباؤ، اور سماجی نامساعدگی کی علامت کے طور پر کھولا۔ نسائی تنہائی کی حیثیت مختلف انداز میں واضح ہوئی: ایک طرف وہ تنہائی جو ذاتی جذبات اور رشتوں کی ناکامی کا آئینہ تھی، دوسری طرف وہ تنہائی جو سماجی ساختوں کی بدحالی، جنسیت کی ضبطگی، اور عوامی مکالمے سے کٹاؤ کی صورت میں محسوس کی گئی۔ اس اظہار سے تنہائی ایک سیاسی باب بھی بن گئی: عورت کی تنہائی معاشرتی انجماد اور اظہار خودی کی محدودیت کی علامت بن گئی، اور اس نے شعری زبان کو ایک نیا تنقیدی شعور فراہم کیا جس نے روایتی تصورات کو چیلنج کیا۔ نسائی شعرا نے تنہائی کے استعارے کو اسلوبیاتی تنوع کے ساتھ استعمال کیا۔ کبھی وہ خاموشی کی ضرب کے طور پر آیا، کبھی خود اظہارِ ذات کی جستجو کے طور پر، اور بار ہا اس نے سماجی خاتون کی علیحدہ شناخت کو واضح کیا جو بظاہر تو آزاد مگر اندر سے مقید تھی۔

جدید شہر اور شہری تجربہ بھی تنہائی کے استعارے کو نئی معنویت فراہم کرتا ہے۔ صنعتی و شہری ثقافت نے جہاں باہمی رابطوں کے میدان وسیع کیے، وہاں انسان کے اندر ایک اخلاقی و جذباتی کٹا پھٹا پن بھی پیدا کیا۔ شہر کا شور، بھیڑ، اور تیز رفتار زندگی فرد کو بیک وقت معاشرتی طور پر قریب اور نفسیاتی طور پر دور چھوڑ دیتے ہیں۔ جدید اردو شاعری نے اسی تضاد کو محسوس کیا اور تنہائی کو شہر کے تناظر میں ایک علامتی ڈھانچہ بنا دیا۔ شہر میں رہتے ہوئے تنہائی کا استعارہ بعض اوقات اس کثیر الجہت وجود کا ملفوظ ہوتا ہے جس کا تعلق جدید فرد کی علیحدگی، ناموافق معاشی حالات، اور تیز رفتار روابط کی سطحی نوعیت سے ہوتا ہے۔ شاعر نے اس تجربے کو بیانی زبان میں منتقل کرتے ہوئے جدید شہریت کے گرفتار کن راستوں کو نمایاں کیا۔

یہاں تنہائی کا مطلب محض اکیلا پن نہیں بلکہ ایک سماجی کیفیت ہے جو جدید طرزِ زندگی، اجتنابِ تعلقات، اور بے ربطی کا نتیجہ ہے۔

ادبی اور نظریاتی سطح پر تنہائی کے استعارے کو

سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی زبان، اس کے استعارے، اور اس کے بیانیہ تکنیکوں کا مفصل جائزہ لیا جائے۔ جدید اردو شاعری میں زبان کی تبدیلیاں، امیجری میں تبدیلی، اور کثیر سطحی ادراک نے تنہائی کا استعارہ ممکن بنایا۔ روایتی شاعرانہ طبیعت میں تجربات کو عموماً اجتماعی یا جمالیاتی اصولوں کے تحت پیش کیا جاتا تھا؛ مگر جدیدیت نے زبان کو تجرباتی بنایا، معنی کو کثیر معنیاتی اور کنایاتی طور پر پیش کیا۔ اس تبدیلی نے شاعر کو ایسے الفاظ، تضادات، اور وقفوں سے کام لینے کی گنجائش دی جو تنہائی کے متوازی معنوں کو ایک ساتھ گھیر لیں۔ لہٰذا تنہائی کا استعارہ ادبی جدت کے ساتھ مربوط یہ ایک ایسی علامت ہے جس میں زبان کی شکل، تکرار، وقفہ، شبیہ، اور ساختیاتی کشمکش سب مل کر معنی سازی کرتی ہیں۔

تنہائی کے استعارے کا ایک فطری محور ادبی موضوعیت اور خودی کی بحث سے ملتا ہے۔ جدید شاعر جب خودی یا "میں" کے مقام پر کھڑا ہوتا ہے تو اس میں ایک دوہری کیفیت نظر آتی ہے: ایک طرف خودی کا تقویت یافتہ موقف، اور دوسری طرف خودی کا انکسار۔ اس تضاد نے تنہائی کو ایک پیچیدہ استعارہ بنا دیا یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر اپنی اہمیت اور علیحدگی کا ادراک کرتا ہے مگر اسی علیحدگی کو مرثیہ انسانی کے طور پر بھی دیکھتا ہے۔ یہی صورتِ حال اشعار اور نظموں میں اس قدر تکرار پاتی ہے کہ تنہائی ایک مرکزی موضوع ہی نہیں رہتی، بلکہ پوری نظم یا غزل کی ساخت کو متعین کرتی ہے۔ ایک علمی زاویے سے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جدید اردو شاعری میں تنہائی کے استعارے کی تشہیر اکثر روایت شکنی کے عمل کے ساتھ ہوتی ہے؛ بند نظم، آزکارہ زبان، اور علامتی امیجری کا استعمال اسی روایت شکنی کا ثمر ہے جو تنہائی کو صوتی و بیانی اعتبار سے ایک مخصوص مقام عطا کرتی ہے۔

تنہائی کے استعارے کا ادبی مطالعہ ایک اور اہم عوامل کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے: معاصر دنیا کی متناظراتی کیفیت، لسانی تبادلے اور عالمی ادبی رجحانات۔ جدید اردو شاعر بیرونی ادبی تحریکوں خصوصاً یورپی وجودی فکر اور جدید انگریزی نظم و نثر کے تجربات سے متاثر ہوئے، یہ اثر زبان، مضمون اور فکری بنیادوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ وجودی فلسفہ کا اثر اس بات میں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر نے فردی تنہائی کو عالمی معنوی بحران کے طور پر دیکھا؛ جہاں فرد کو نہ صرف سماجی سطح پر کٹاؤ کا سامنا ہے بلکہ وجودی خلا بھی اس کا حلقہ بن گیا ہے۔ اس نظریاتی پس منظر نے شاعری کو ایک بین الاقوامی فکری مقام پر کھڑا کیا، مگر اردو شاعری نے ہمیشہ ہی ان افکار کو مقامی تاریخی و ثقافتی تجربات کے زاویے سے جوڑا، جس کے نتیجے میں تنہائی کے استعارے نے ایک منفرد تہذیبی رنگ اختیار کیا۔

تحقیقی اور تنقیدی مباحث میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ تنہائی کا استعارہ صرف منفی کیفیت نہیں بلکہ ایک تخلیقی قوت بھی ہے۔ تنہائی بعض اوقات تخلیقی آفرینش کا میدان بن جاتی ہے جہاں شاعر اپنے اندر کے تناؤ کو زبان میں تبدیل کر کے نئی جمالیات پیدا کرتا ہے۔ اس طرح تنہائی فنِ شاعری کے لیے ایک محرک بھی بن جاتی ہے، ایک ایسی فضا جہاں خیال کی گاڑھی کثافت پیدا ہوتی ہے۔ اس زاویے سے شاعر کی تنہائی، اس کے فکری ارتقاء اور اس کے بیانی تجربات باہم مربوط ہیں۔ تنہائی نے جدید اردو شاعری میں موضوع کے ساتھ ساتھ اسلوبی تبادلوں کو بھی جنم دیا ہے۔ نظم کی بندش و گریز، زبان کی سادگی و پیچیدگی، اور خیال کے متلاشی انداز سب اسی عمل کے آئینے ہیں۔

ایک تحقیقی مطالعہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف شعری شخصیات کے مابین تنہائی کے استعارے کی تفاوت کو واضح کیا جائے۔ ہر شاعر نے تنہائی کو اپنے فکری، عمرانی اور جمالیاتی پس منظر کے مطابق سمجھایا اور استعمال کیا۔ ن م راشد کی تنہائی فکری بدویت اور فلسفیانہ بلند پروازی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، میراجی کی تنہائی نفسیاتی کثافت اور جنسی ماحول سے متاثر ہے، فیض کی تنہائی سیاسی شکست اور امید کے درمیان مضمر ہے، پروین شاکر کی تنہائی نفسیاتی و جذباتی بافت میں سرگرداں ہے، اور افتخار عارف کی تنہائی صوفیانہ و تقدیری رجحان کی طرف مائل محسوس ہوتی ہے۔ یہ تفاوت اس بات کا ثبوت ہے کہ تنہائی کا استعارہ محض ایک یکسانی علامت نہیں بلکہ ایک کثیرالجہتی ادبی روایت کا حصہ ہے جس میں ہر شاعر نے اپنی مخصوص صوت، مکالمہ اور تصویر کشی کے ذریعے تنہائی کے مختلف رنگ دکھائے۔

تاریخی تناظر میں بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ جدیدیت کے ابتدائی مرحلوں میں تنہائی کے استعارے نے جن معنوں کو جنم دیا، وہ بعد ازاں مختلف ادبی رجحانات میں ارتقائی شکلیں اختیار کرتے گئے۔ مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک نے تنہائی کو اجتماعی محرومی اور طبقاتی تنہائی کے طور پر مواد دی، جبکہ بعد ازاں لسانی و ثقافتی تغیرات نے اس استعارے کو نسائی تنہائی، شہری تنہائی اور ماحولیاتی تنہائی کے روپ میں توانا کیا۔ اس طویل مدتی ارتقاء کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ تنہائی کا استعارہ متحرک ہے، بدلتا ہے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے مفاہیم پیدا کرتا رہتا ہے۔

جدید ادبی تنقید کے اصولوں کے مطابق، تنہائی کے استعارے کی تشریح میں ہمیں بیانی تکنیکوں، لغوی انتخاب، اور تشبیہاتی ڈھانچوں کا بغور جائزہ لینا چاہیے۔ شاعر جب تنہائی کو استعارہ کے طور پر استعمال کرتا ہے تو وہ عموماً مخصوص لغات، کلیشے، اور امیجری فریم ورک کا سہارا لیتا ہے جو قاری کے ذہن میں فوری

معانی کے تسلسل کو جنم دیتے ہیں۔ ایک تحقیقی مطالعے میں ان بیانی عناصر کو منقطع کر کے دیکھنا چاہیے : کون سی اصطلاحات تنہائی کی عکاسی کے لیے بار بار استعمال ہوتی ہیں، کون سی تصویریں اس احساس کو مستحکم کرتی ہیں، اور زبان کی کون سی تعبیرات اس استعارے کو مزید معنوی بناتی ہیں۔ اس تناظر میں تجزیاتی کام شاعری کے اندرونی اصولوں کو بے نقاب کرتا ہے اور استعارے کے پوشیدہ معنوی لاٹ کو کھولتا ہے۔

مزید برآں، جدید اردو شاعری میں تنہائی کے استعارے کا ایک اہم رجحان یہ بھی ہے کہ یہ استعارہ احساسِ وقت اور تاریخ کے ساتھ گہرائی میں جڑ جاتا ہے۔ یعنی شاعر کی تنہائی عموماً حال کے مخصوص وقت کی عکاسی کرتی ہے۔ کبھی جنگ، جلاوطنی، ہجرت یا سیاسی کدمات کے پس منظر میں، کبھی شہری منتقلی اور جدید ٹیکنالوجی کے عہد میں۔ اس طرح تنہائی کا استعارہ وقت کے مخصوص لمحے کا آئینہ بنتا ہے۔ اس حقیقت سے تحقیقاتی کام میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تنہائی کے استعارے کی پائیداری اور تبدیلی دونوں کا تعلق تاریخی حالات سے استوار ہے؛ جب حالات تبدیل ہوتے ہیں تو اس استعارے کے مفاہیم بھی تبدیل ہوتے ہیں اور اس کے بیانی طریقے نئے رنگ اپناتے ہیں۔

تنہائی کے استعارے کے سماجی اثرات پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ ادب کا ایک مقصد معاشرہ کو آئینہ دکھانا ہوتا ہے اور تنہائی کا استعارہ اسی آئینے کا ایک اہم عکس ہے۔ جب شاعر معاشرتی بے ربطی، خاندانی ٹوٹ پھوٹ یا اقتصادی محرومی کو تنہائی کے روپ میں بیان کرتا ہے تو وہ قاری کو سماجی تبدیلیوں کے فکری اور اخلاقی مضمرات سے روشناس کراتا ہے۔ اس لحاظ سے جدید اردو شاعری میں تنہائی کے استعارے نے نہ صرف ادبی زبان کو غنی کیا بلکہ سماجی شعور کو بھی متحرک کیا۔ تنہائی کا ادبی خاکہ عام طور پر موجودہ حالات زندگی پر سوال اٹھاتا ہے : کیا وہ نظام جو ہمیں کنارہ زن بناتا ہے، ہمیں ایک دوسرے سے دور کرتا ہے؟ یہ سوالی لمحات تنقیدی مباحث کو جنم دیتے ہیں اور ادبی تحقیق کے لیے گراں قدر مواد فراہم کرتے ہیں۔

تحقیقاتی نتائج کی وضاحت کرتے ہوئے ایک لازمی پہلو یہ بھی ہے کہ جدید اردو شاعری میں تنہائی کا استعارہ متعدد مراتبان میں فنکاری کا باعث بنتا ہے۔ یہ سطح بہ سطح معنوی امکانات فراہم کرتا ہے : لسانی سطح پر یہ استعارہ الفاظ کی انتخاب اور نحوی ساخت کو متاثر کرتا ہے؛ خیالی سطح پر یہ مخصوص امیجر اور تصویریات کو جنم دیتا ہے؛ اور نظریاتی سطح پر یہ موضوعاتی مباحث کو فروغ دیتا ہے۔ ایک محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام مراتب کا یکجا مطالعہ کرے تاکہ استعارے کی ہموار اور متنازعہ دونوں جہات کو سمجھا جا سکے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید اردو شاعری میں تنہائی کا استعارہ ایک جامع اور کثیر البنیادی علامت ہے جو فرد، سماج، تاریخ اور زبان کے باہمی رشتوں کو واضح کرتا ہے۔ اس استعارے کی تحقیق سے نہ صرف ادب کی فنی صورتوں کی بہتر تفہیم ممکن ہے بلکہ یہ ہمیں انسانی تجربے کی گہرائیوں، تہذیبی تبدیلیوں، اور فکری تناؤ کی بھی خبر دیتی ہے۔ جدید اردو شاعری نے تنہائی کو ایک تخلیقی موقع کے طور پر استعمال کیا؛ اس نے حرف، معنی اور ساخت کے ذریعے اس کیفیت کو تبدیل کیا اور ایک ایسی زبان پیدا کی جو خاموشی میں بھی بولتی ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس استعارے کی مطالعہ آگے بڑھانا ضروری ہے، خاص طور پر مختلف زمانوں، جغرافیوں اور صنفی تجربات کے موازنہ کے ذریعے، تاکہ اس کثیر الجہتی علامت کے مزید پوشیدہ اور پیچیدہ پہلو عیاں ہو سکیں۔

احمد جلیل/اوکاڑہ

سلگتی سوچوں کو میں نے ابھی مصلوب کرنا ہے
پھر اس کے نام اپنا ہر سخن منسوب کرنا ہے
مجھے معلوم ہے خوابوں خیالوں سے حسیں تم ہو
تمہارے حسن کو تو خوب سے بھی خوب کرنا ہے
نگاہیں منتظر ہیں جانے کب سے پردہ اُٹھنے کی
بتاؤ حسن کو کب تک یونہی محجوب کرنا ہے
سوائے اس کے اب محبوب کوئی ہو نہیں سکتا
اسی کو دل میں رکھنا ہے اسے محبوب کرنا ہے
کسی سے بھی تعلق اب نہیں رکھنا بجز اس کے
اسی کا نام جپنا ہے اسے مطلوب کرنا ہے
جلیل اب چھان لی ہے خاک صحراؤں کی جی بھر کے
فقط دیوانگی میں خود کو اب مجذوب کرنا ہے

شہزاد دیپ/جھنگ

دشت ہو اور اُس میں پیاس نہ ہو
کیا کہا؟ دل ہو اور اُداس نہ ہو
کیسے ممکن ہے میری جانِ حزیں
رنج راحت کے آس پاس نہ ہو
تو بھی کچھ ایسے مجھ کو راس نہیں
آگ کو ، پانی جیسے راس نہ ہو
وقت گزرا تو یہ کُھلا مجھ پر
جو بھی کچھ خاص ہے یہ خاص نہ ہو
دیپ میں نے بجھا دیا ، یوں بھی
کہ تری آخری بھی آس ، نہ ہو

شاعرو! عوامی اصلاح سے بچو

ظفر سیّد

اردو کے منفرد شاعر اور منھ پھٹ نقاد ساقی فاروقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاعر کو شعر کہتے وقت زبان و بیان کے سارے امکانات اچھی طرح سے کھنگال لینے چاہییں، ورنہ عوام اس شعر کی اصلاح کر دیتے ہیں۔ ساقی فاروقی فراق کے اس شعر کا ذکر کر رہے تھے:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

لیکن شاید عوام کو شعر کی یہ شکل پسند نہیں آئی کیوں کہ شعر کچھ یوں مشہور ہے:

شبِ وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے شباب کی دوشیزگی نکھر آئی

ظاہر ہے کہ جمال کی دوشیزگی کی جگہ شباب کی دوشیزگی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اسی طرح پہلے مصرعے میں ذرا وصال۔۔۔ کی بجائے شبِ وصال ۔۔۔نے بھی شعر کی رنگینی میں اضافہ کر دیا ہے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ شاعر تو چند لمحوں کے اندر شعر کہہ کر الگ ہو جاتا ہے اور وہ شعر اگر مشہور ہو جائے تو یوں سمجھیے کہ عوامی ڈومین میں آ جاتا ہے۔ اب یہ تو آپ جانتے ہی ہیں زبان ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے اندر بے تحاشا امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں اور کسی شخصِ واحد کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ بیک وقت تمام پہلوؤں پر قادر ہو سکے۔ اس لیے پبلک اپنے طریقے سے اس شعر کے ڈھانچے کو ٹٹولتی، پھرولتی اور اپنے اپنے خانوں میں رکھ کر دیکھتی ہے۔ اگر شعر کسا کسایا، گٹھا ہوا اور پوری طرح سے نک سے درست اور بے عیب نہ ہو تو زبان در زبان، سینہ بہ سینہ نقل در نقل کے عمل کے دوران شعر کی ساخت بدلنے کا احتمال رہتا ہے۔

ہم کوئی دعویٰ نہیں کر رہے کہ معاشرے کا اجتماعی شعور دھوکا نہیں کھا سکتا، تاہم دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ بسا اوقات اشعار کی عوامی شکل اصل سے بہتر نکلتی ہے۔

اسی عوامی اصلاح کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

قائم چاند پوری میر و سودا کے عہد کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ان کا شعر زباں زدِ خاص و عام ہے:

قسمت کی خوبی دیکھیے، ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر قائم کی کلیات کھول کر دیکھیں، تو یہ شعر کچھ یوں لکھا نظر آتا ہے:

قسمت تو دیکھ، ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

فرق صاف ظاہر ہے۔۔۔ دو چار ہاتھ میں جو سنسنی خیزی اور حرکت ہے، وہ کچھ دور میں کہاں۔ اسی طرح قسمت کی خوبی دیکھیے۔۔۔ میں لفظ خوبی نے طنزیہ کیفیت پیدا کر دی ہے، جس سے شعر کی تہہ داری بڑھ گئی ہے۔

میر طاہر

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملے جس کو سبق یاد رہے

عوام:

مکتبِ عشق کے دستور نرالے دیکھے
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

آپ نے دیکھا کہ عوامی شعر کی بندش اصل شعر سے کہیں چست ہے۔ ظاہر ہے کہ میر طاہر کو ردیف کی مشکل بھی درپیش رہی ہوگی، جب کہ عوام کے سامنے اس طرح کی کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی، کیوں کہ اس غزل کے دوسرے اشعار تو کیا، لوگ مرزا طاہر کے کسی اور شعر سے واقف نہیں ہیں۔

مومن

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

عوام

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

شاید آپ مجھ سے اتفاق کریں کہ لپک اس قدر متحرک لفظ ہے کہ اس کے سامنے چمک کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔

ایک مصرع بہت مشہور ہے اور عام طور پر کسی ادیب کو داد دینے کے موقعوں پر خاص طور پر استعمال کیا جاتا ہے:

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

یہ دراصل داغ کا شعر ہے لیکن انھوں نے اس شعر کو کسی اور انداز میں کہا تھا:

داغ:

خط ان کا بہت خوب، عبارت بہت اچھی
اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ

ملاحظہ ہو کہ اس شعر میں داغ صرف خطاطی کی داد دے رہے ہیں، نہ کہ تحریر کے مضمون کی۔

شاگرد تو دیکھ لیا، اب ذرا داغ کے استاد کا بھی ذکرِ خیر ہو جائے، یعنی استاد شیخ ابراہیم ذوق:

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

پہلے مصرعے میں مسئلہ یہ تھا کہ مخاطب تو صبا ہے لیکن یہ لفظ دوسرے الفاظ کے درمیان اس طرح سے گھر گیا ہے کہ پہلی قرات میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے

پھول صبا دکھلا گیے، جو بے معنی سی بات ہے۔ اگر جدید علاماتِ قرات استعمال کی جائیں تو شعر کچھ یوں لکھا جائے گا:

کھل کے گُل کچھ تو بہار اپنی، (اے) صبا!، دکھلا گیے

عوام کو یہ پیچیدگی پسند نہیں آئی، اس لیے انھوں نے بدل کر شعر کچھ یوں کر دیا:

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گیے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گیے

قافیے کی تبدیلی سے شعر زیادہ رواں ہو گیا ہے۔ یہ شعر عام طور پر قبرستانوں میں بچوں کی قبروں پر لکھا نظر آتا ہے۔

اس موقعے پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہمارا قطعاً یہ خیال نہیں ہے کہ کسی کو شاعر کے کلام میں تحریف کا حق حاصل ہے۔ شعر جیسے لکھا گیا، وہ پتھر کی لکیر کی طرح سے اٹل رہنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ جیسے ندی میں پڑا ہوا پتھر کا ٹکڑا پانی کی ٹھوکریں کھا کھا کر ہموار، گول مٹول اور چکنا ہو جاتا ہے، ویسے ہی پبلک بھی شعر پڑھتے پڑھتے ادھر ادھر نکلے ہوئے کونے رگڑ رگڑ کر سیدھے کر دیتی ہے۔

پتھر کا ذکر چل نکلا ہے تو ذرا نسبتاً جدید زمانے کے شاعر مصطفیٰ زیدی کا بے حد مشہور شعر ملاحظہ فرمائیے:

انھی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

میں نے کہا کہ مصطفیٰ زیدی کا شعر۔ لیکن اگر آپ مصطفیٰ زیدی کا دیوان کھول کر دیکھیں تو اس میں دوسرا مصرع یوں ہے:

میرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

یہاں پر کوئی کا لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ اس لفظ کے درجنوں معنی نکلتے ہیں۔ عوامی شعر میں کوئی کا مطلب some نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے، بالکل، ہرگز، کسی بھی صورت میں۔ یہ وہی استعمال ہے جو اس محاورے میں ملتا ہے:

یہ دشتِ عشق ہے میاں، کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے

اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ دشتِ عشق ہرگز ہرگز اور کسی بھی صورت میں خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ اس کے مقابلے پر کہیں سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ گھر کے راستے میں دوسری چیزیں بھی ہیں، یعنی پہاڑ، دریا، کھائیاں، لیکن اس تمام راستے میں کسی مقام پر کہکشاں نہیں ہے۔

دیوار کیا گری میرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

یہ شعر ہے سبط علی صبا کا، لیکن صبا نے شعر کی جو شکل لکھی تھی وہ تھوڑی مختلف تھی:

دیوار کیا گری میرے خستہ مکان کی

اب دیکھیے کہ خستہ کے مقابلے میں کچا زیادہ برجستہ اور موزوں لفظ ہے اور مصرعے کی چستی میں اضافہ کر رہا ہے۔ یہاں ایک واقعے کا ذکر کرتا چلوں۔ کچھ عرصہ قبل ایک صاحب نے یہ شعر عوامی طریقے سے پڑھا۔ ہم نے فوراً اپنی قابلیت جتانے کے لیے اضافہ کرنا ضروری سمجھا:

کچے مکان کی نہیں خستہ مکان کی

وہ صاحب چمک کر بولے، خستہ تو بسکٹ ہوتا ہے، پیسٹری ہوتی ہے، دیوار نہیں!

قارئین سے مودبانہ گذارش ہے کہ اس مضمون کی روشنی میں کسی کی اصلاح فرمانے سے پیشتر اس واقعے کو ذہن میں رکھیے گا تو آپ کو بھی اس موقعے پر بغلیں بجانے والے محاورے کی عملی تصویر نہ بننا پڑے۔

مضمون کا اختتام ایک بھاری پتھر اٹھانے سے کر رہا ہوں۔ چچا غالب کی مشہور ترین غزلوں میں سے ایک ہے:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس غزل کو کئی لوگوں نے گایا ہے، جن میں سہراب مودی کی مرزا غالب نام کی فلم میں ثریا بھی شامل ہیں۔ لیکن شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ اس غزل کی ردیف کچھ اور ہے۔ دیوانِ غالب غالب کی زندگی میں پانچ بار شائع ہوا اور ہر نسخے میں آپ کو ردیف ہوتے تک ملے گی، نہ کہ ہونے تک۔ ہماری تحقیق کے مطابق انیسویں صدی میں غالب کے جو بھی نسخے شائع ہوئے ان میں ہوتے تک لکھا تھا۔ بیسیوں صدی کے شروع میں کسی ستم ظریف کاتب نے غالب کی اصلاح کرتے ہوئے ہونے تک کر دیا، اور اس کے بعد چل سو چل۔

اب ہوتے تک میں جو مسئلہ ہے وہ صوتیات سے تعلق رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ قارئین ہم سے اتفاق نہ کریں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ ہوتے تک میں ت کی تکرار کانوں کو تھوڑی ناگوار گزرتی ہے۔ اصل میں یہ چیز شاعری کا عیب سمجھی جاتی ہے اور تکنیکی زبان میں اسے تنافر کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے پر صوتی اعتبار سے ہونے تک کہیں زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ دونوں صورتوں میں کوئی خاص معنوی فرق نہیں ہے۔

ہم نے اس مضمون کے عنوان کے ذریعے ابھرتے ہوئے شعرا کو ایک مشورہ دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مضمون کے آخر تک پہنچتے پہنچتے ہمیں احساس ہو گیا ہے کہ اس پر عمل کرنا آگ پر چلنے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مرزا غالب اس سے نہیں بچ سکے تو پھر کسی اور سے کیا گلہ؟

"ہندکو رہتل" عبدالوحید بسمل کا تہذیبی کارنامہ

قمر زمان، ایبٹ آباد

تہذیب و ثقافت اور تمدن ہی دراصل کسی معاشرے کی پہچان ہوتے ہیں۔ہم کسی فرد کے لباس اس کی زبان اور اس کے انداز سے یہ جان لیتے ہیں کہ اس کا تعلق کس معاشرے، کس ملک سے ہے۔تہذیب،ثقافت اور تمدن ایسی اصطلاحات ہیں جن کی مشرق و مغرب کے علمائے عمرانیات و بشریات نے سینکڑوں تعریفیں کی ہیں،اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔تہذیب و ثقافت کے موضوع پر انگریزی ادب کے معروف نقاد اور شاعر میتھیو آرنلڈ کی ثقافت و انتشار کلچر اینڈ انارکی سے لے کر ٹی ایس ایلیٹ کی نوٹس ٹورڈز ڈیفینیشن آف کلچر (Notes towards definition of culture) تک سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور لکھی جا رہی ہیں۔۔اردو کے مایا ناز اہل قلم ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر داؤد رہبر، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر رشید امجد ،ایس ایم اکرام اور عکسی مفتی کے علاوہ بہت سارے اہل قلم نے اس موضوع پر مشرق کے نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔میتھیو آرنلڈ نے کلچر کو روحانیت کے ہم پلہ اور مادیت کی نفی کے طور پر استعمال کیا ہے، وہ عظیم صاحبان کلچر ان لوگوں قرار دیتا ہے جو اپنے خیالات کو سماج کے سدھار اور بہتری کے لیے استعمال کرتے ہیں اردو کے ممتاز دانشور ڈاکٹر داؤد رہبر نے اپنی مختصر مگر جامع تعریف میں کلچر کو زندگی کی ہانڈی پکانے کی ترکیب کا نام دیا ہے۔گویا جو تشکیلی عناصر زندگی کے ہیں وہی ثقافت کے ہیں۔ان میں کسی معاشرے کے مذہبی عقائد، زبان ،لباس ،رسوم و رواج ،تہوار ،اخلاقیات ،صنعت و حرفت، فنون لطیفہ، فن تعمیر، قوانین، انفرادی و اجتماعی طرز احساس ،روایتی کھیل تماشے، کھانے ، گویا مکمل زندگی کے طور طریقے اور رنگ ڈھنگ شامل ہیں۔عبدالوحید بسمل نے ہندکو رہتل میں بڑی باریک بینی سے ان تمام نظری مباحث کی عملی صورت گری کر کے ہزارہ کی ثقافت کو دستاویزی صورت میں محفوظ کر لیا ہے۔اس کتاب کو حسب ذیل چھ ابواب میں تقسیم کر کے ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔پہلا باب پیدائش سے لے کر چار پانچ سال کی عمر میں بچے کے مسجد میں داخل ہونے اور بنیادی اسلامی تعلیمات کے آغاز تک محیط ہے۔دوسرا باب شادی بیاہ کی رسومات اور منگنی سے لے کر شادی کے خاتمے تک کی رسموں اور رواجوں کا احاطہ کرتا ہے۔تیسرے باب میں غمی یعنی موت مرگ کے موقع پر ادا کی جانے والی رسومات، پُرسہ دینے کی معاشرتی و نفسیاتی واہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ہزارہ کے لوگوں کے اہم پیشے اور ان کی بنیادی معلومات دی گئی ہیں۔پانچویں باب کا تعلق ہزارہ کے قدیم اور روایتی کھیلوں سے ہے۔آج کی نسل کو ان کھیلوں سے آگاہ کرنے کے لیے ان کی مکمل تفصیل درج کی گئی ہے۔چھٹے باب میں عبدالوید بسمل نے متفرق ثقافتی مظاہر کو اجاگر کیا ہے جن میں لباس ،کھانے ،رشتے ناطے، ان کے آپس کے تعلقات دیہات میں مختلف مواقع پر استعمال ہونے والے اوزار، چھوٹی موٹی بیماریوں کے دیسی علاج اور ٹوٹکے، ہل جل کر کام کرنے کی بعض رسموں اور کچھ دیگر ثقافتی عناصر پر دادِ تحقیق دی گئی ہے۔جو عبدالوحید بسمل کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ان تمام ابواب میں اس قدر تفصیل سے ثقافت کے تشکیلی عناصر پر بحث کی ہے کہ کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہ گیا۔آج کی نسل کو ان میں سے بہت کم ثقافتی عناصر سے آگاہی ہوگی ،بلکہ گاؤں دیہاتوں سے دور شہروں میں جا کر بس جانے والے عبدالوحید بسمل کے بعض معاصرین کو بھی ان میں سے بعض ثقافتی روایات سے آگاہی نہیں ہوگی۔یوں عبدالوید بسمل نے ہزارہ کی ثقافت کو آنے والے وقتوں کے لیے محفوظ کر کے اہل ہزارہ پر ایک طرح سے احسان کیا ہے۔مہذب اور تعلیم یافتہ معاشروں میں ایسے کام ادارے کیا کرتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہم اس اعتبار سے فکری بانجھ پن کا شکار ہیں۔اپنی ثقافت اور اپنی روایات و اقدار سے زیادہ زندگی کی دوڑ میں آگے نکل جانے کی خواہش کی وجہ سے اپنی تہذیب و ثقافت اور روایات سے بیگانہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ہم ایسے لوگوں کے لیے عبدالوحید بسمل کی یہ کتاب ایک یاد دہانی بھی ہے۔ایک ایسے وقت میں جب ہم ہر طرف سے بیرونی ثقافتی یلغار کی زد پر ہیں عبدالوحید بسمل کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کتاب کا انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کر کے اس کو وسیع پیمانے پر پھیلا دیا جائے تا کہ مٹتی ہوئی تہذیبی ثقافتی روایات کا احیا ہو سکے۔میں یہ کہنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتا کہ یہ عبدالوحید بسمل کا ایک تہذیبی کارنامہ ہے۔یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جو ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔عبدالوحید بسمل ہندکو زبان کی ثروت مندی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ان کا ہندکو ریڈیائی ڈراموں کھیڈاں سے شروع ہونے والا سفر تسلسل سے جاری ہے۔تہذیب و ثقافت جیسے موضوعات پر لکھنے کے لیے مسلسل تحقیق و جستجو کی ضرورت ہوتی ہے۔عبدالوحید بسمل نے جس طرح ثقافت کے نظری مباحث کی عملی صورت گری کر کے نہ صرف ان کی تفہیم کو آسان بنا دیا ہے، بلکہ ان پر ایک مختلف زاویے سے نگاہ ڈالنے کی سعی کی ہے وہ ان کی عمر بھر کی ریاضت اور ان کے مشاہدات کا حاصل ہے۔۔انہوں نے نہ صرف اپنی تہذیب و ثقافت کو

اجاگر کیا ہے بل کہ تہذیب سے جڑے لوگوں کے مزاج تک کو اپنی تحقیق و جستجو سے اجاگر کیا ہے۔معاشرے اپنی مثبت سماجی اقدار و روایات اور اپنی تہذیبی و ثقافتی برتری کی وجہ سے معتبر ہوتے ہیں۔ان تہذیبی و ثقافتی روایات کو آنے والی نسلوں کے لیے دستاویزی طور پر محفوظ کرنا اتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا ان کے لیے زندگی کی مادی سہولیات بہم پہنچانا ہے۔عبدالوحید بسمل نے جتنی محنت اور جان فشانی سے یہ اہم کام سرانجام دیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ایسے کام عام طور پر ادارے کیا کرتے ہیں، جو انہوں نے اپنی زبان اپنی تہذیب و ثقافت کی محبت میں تن تنہا انجام دیا ہے۔اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت فطری طور پر ہر انسان کے دل میں موجود ہوتی ہے۔چاہے وہ افریقہ کے رہنے والے حبشی ہوں یا امریکہ و یورپ جیسے ترقی یافتہ معاشرے کے رہنے والے انسان ہوں، سب اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت کرتے ہیں۔ ہزارہ کی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے اس سے پہلے 2012ء میں محمد بشیر رانجھا نے اردو زبان میں ایک اہم کتاب ثقافت ہزارہ اور اس کا تہذیبی پس منظر کے نام سے مرتب کرکے ہزارہ کی ثقافت کو محفوظ کرنے کی ایک کاوش کی ہے ۔یہ کتاب ہزارہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام پروفیسر بشیر سوز نے مرتب کرائی تھی۔اس کتاب میں ہزارہ کی تہذیب و ثقافت کے اساسی مباحث، زبان، لباس کے علاوہ ثقافت کے آغاز ، ادب، ہزارہ کے لوگ گیت ہزارہ کے خوشی غم کے رسومات، لوک رقص ہزارہ کی داستانیں کھیلوں اور کھیتوں کھلیانوں کو موضوع بنایا گیا ہے تاہم اس کتاب کے مؤلف کا تعلق پنجاب سے تھا جبکہ عبدالوحید بسمل نے جس مٹی میں جنم لیا اس کی تہذیب و ثقافت کے تمام موضوعات کو گہری عرق ریزی سے اپنی جزئیات سمیت محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔عبدالوحید بسمل کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ماں بولی کی جھولی میں ایک اور عمدہ موتی ڈال کر اس کو مزید ثروت مند کیا ہے یہ ایک طرف ان کی اپنی زبان کے ساتھ محبت کی دلیل ہے تو دوسری طرف ان کے تہذیبی شعور کا آئینہ دار ہے۔انہوں نے ایک طرف ہندکو زبان کے بہت سارے ایسے الفاظ اور اصطلاحات کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو معدوم ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں، تو دوسری طرف تہذیب و ثقافت کے بعض مٹتے ہوئے نقوش کو دوبارہ اجاگر کر دیا ہے۔جس کی طرف انہوں نے کتاب کے دیباچے دل دی گل میں بھی اشارہ کیا ہے۔ہندکو رہتل کی ایک اور اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ضرورت اور ان کی تہذیبی و معاشرتی اور انتظامی و نفسیاتی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے جو اس کے کتاب کو ایک ممتاز مقام دلاتی ہے۔اس کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں تاہم بس دو مثالوں سے بات واضح کرنے کی کوشش کروں گا عبدالوحید بسمل نے جرگے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس جگہ جرگہ کا رواج ہو وہاں چھوٹے موٹے مسائل خود ہی حل ہو جاتے ہیں، جرگے کی معاشی اہمیت پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کے ذریعے فیصلہ ہونے کی صورت میں فریقین عدالتوں کچہریوں کے جو اخراجات اٹھانے سے بچ جاتے ہیں۔اس کی نفسیاتی اہمیت کو انہوں نے کچھ یوں اجاگر کیا ہے کہ فریقین میں سے ہر شخص سوچ سمجھ کر بات کرتا ہے تاکہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو بعد میں بات کرنے والے کے لیے شرمندگی اور جگ ہنسائی کا باعث بنے۔اسی طرح شادی بیاہ کی ایک رسم جسے ہندکو میں رُخ کڈھانڑا کہتے ہیں اور جو نئی آنے والی دلہن کے حوالے سے ہے، اس کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ یہ رسم معاشرتی اور نفسیاتی اہمیت کی حامل ہے جس میں ایک ناواقف اور نئی لڑکی کو نئے ماحول سے آشنا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ساتھ ہی دلہن کے ہاتھوں کو رزق میں پھیرنا باعث برکت اور نیک شگون سمجھا جاتا ہے کہ جس گھر میں یہ نئی نویلی دلہن آئی ہے اس میں ہمیشہ رزق کی فراوانی رہے۔ عبدالوحید بسمل نے برادری اور اس کے تنظیمی معاملات کو لوکل گورنمنٹ سے مشابہ قرار دیا ہے کہ جس طرح لوکل گورنمنٹ لوگوں کے مسائل کو حل کرتی ہے اسی طرح برادری بھی، لوگوں کے مسائل کے حل کا ایک مستعد ادارہ ہے۔جو صدیوں سے رائج ہے بڑے احسن طریقے سے اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ عبدالوحید بسمل نے بڑی محنت لگن اور مسلسل کوشش سے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔اس لگن اور اپنی زبان و تہذیب و ثقافت سے محبت نے اس کتاب کو وقیع بنا دیا ہے۔اس کتاب کے ذریعے انہوں نے اپنے آپ کو ایک بہترین محقق اور ایک سماجی سائنسدان بھی ثابت کیا ہے۔جس کی نظر سماج کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں غموں اور ان کے مسائل پر رہتی ہے اس کتاب کے ذریعے انہوں نے اپنی ماں بولی کہ بہت سارے الفاظ و اصطلاحات کا احیاء بھی کیا ہے موجودہ نسل نا آشنا ہے۔

عبدالوحید بسمل نے بڑی باریک بینی سے اپنی ثقافت کی اکائیوں کو یکجا کیا ہے انہوں نے کتاب کے آخر میں دیسی علاج معالجوں اور جڑی بوٹیوں سے متعلق بھی عمدہ معلومات دی ہیں۔ان کی یہ کتاب اپنی زبان اپنی تہذیب و ثقافت سے بے پناہ محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے عبدالوحید بسمل اپنے اس تہذیبی کارنامے پر بے پناہ داد و تحسین کے مستحق ہیں اور بڑے سے بڑے اعزاز کے مستحق ہیں۔ہمارے جیسے معاشروں میں جہاں ہر طرف مادیت پرستی اور مالی منفعت کا دور دورہ ہے وہاں عبدالوحید بسمل جیسے صاحبانِ قلم کا دم غنیمت ہے جو بجائے کسی مالی منفعت کے اپنے حصے کا کام خلوص نیت سے انجام دیتے ہیں۔

نوبیل انعام اور پاکستان کا گم ہوتا ہوا ادبی شعور

فرقان علی/پشاور

رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز نے حال ہی میں 2025 کا نوبیل انعام برائے ادب ہنگری کے ناول نگار اور اسکرین رائٹر لاسزلو کراسنا ہورکائی کو دیا ہے ان کے اُس پر اثر اور بصیرت افروز ادبی کام کے اعتراف میں جو قیامت خیز خوف کے بیچ فن کے اثر ورسوخ کو از سرِ نو ثابت کرتا ہے۔

یہ خبر سن کر یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے : کیا پاکستان میں بھی ایسا ممکن ہے؟ کیا ہم کسی ایسے پاکستانی ناول نگار یا شاعر کا تصور کر سکتے ہیں جس کے الفاظ سرحدوں سے ماورا ہو کر عالمی ادبی منظر نامے کو بدل دیں؟

آخر یہ وہ زرخیز سرزمین ہے جس نے شاندار ادبی ورثے کو جنم دیا تیسری صدی قبل مسیح کے سنسکرت قصہ پنچ تنتر سے لے کر ترقی پسند تحریک کے مصنفین تک۔ لیکن آج پاکستان کا ادبی منظر نامہ ایک خلا کو ظاہر کرتا ہے : ظاہری چمک دمک کے ساتھ مگر اندر سے کھوکھلا وہ گہرائی اور سماجی شعور عنقا ہے جو کبھی بڑے ادب کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ آج کا ادبی کلچر زیادہ تر غیر سیاسی اور طبقہ بالا تک محدود ہو چکا ہے فیسٹیولز، کتابوں کی رونمائیاں اور پبلشنگ ہاؤسز محض شہری انگریزی بولنے والے اشرافیہ کے میل ملاپ کے مقامات بن چکے ہیں جبکہ نچلے طبقے کی آوازیں اور نئے لکھاری پس منظر میں گم ہیں۔

اصل مسئلہ محض ادبی حلقوں کی بندش نہیں بلکہ مطالعے کے کلچر کے فقدان سے شروع ہوتا ہے۔ یہ کمی صرف پاکستان تک محدود نہیں بلکہ ایک عالمی رجحان بن چکی ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جس ریڈنگ ریولوشن (Reading Revolution) نے تہذیب انسانی کو بدل دیا تھا، آج وہ جذبہ ماند پڑ چکا ہے۔ اُس دور میں مطالعہ بادشاہوں سے کسانوں تک پھیل گیا تھا۔ کتابیں پڑھنا ایک جمہوری عمل تھا۔ مورخین نے اسے بخار اور جنون قرار دیا تھا ایک ایسا پرامن انقلاب جس نے دنیا بدل دی۔

جہاں پہلے لوگ چند کتابوں کو بار بار پڑھتے تھے (intensive reading)، وہیں اس انقلاب نے کثیر المطالعہ کلچر (extensive reading) کو جنم دیا۔ لوگ تاریخ، فلسفہ، سائنس، الٰہیات اور ادب کے رسائل و جرائد پڑھنے لگے۔ برطانیہ میں 1750 میں نئے عنوانات کی اشاعت 100 فی سال تھی، جو 1825 میں 600 اور صدی کے اختتام تک 6,000 تک پہنچ گئی۔ یہ وہ عہد تھا جب تحریر نے طاقت اور عوام کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔

مگر وہ بخار اب ختم ہو چکا ہے۔ آج کا ڈیجیٹل دور، جہاں مختصر ویڈیوز اور الگورتھمک فیڈز کا راج ہے، وہاں احساس کو عقل پر فوقیت حاصل ہے۔ مطالعہ جو کبھی آہستہ، گہرا اور سوچنے پر مجبور کرنے والا عمل تھا اب ایک تیز ردعمل پر مبنی کلچر سے تبدیل ہو چکا ہے۔ توجہ کے اوقات مختصر ہو گئے ہیں؛ تجسس مرجھا گیا ہے۔

دی اٹلانٹک کی ایک رپورٹ کے مطابق آج کل حتیٰ کہ آئیوی لیگ یونیورسٹیوں کے طالب علم بھی مکمل کتابیں ختم کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں جو محض دس سال پہلے ناقابلِ تصور تھا۔

پاکستان میں یہ زوال کہیں زیادہ تیزی سے ہوا ہے۔ پاکستان بیورو آف اسٹیٹسٹکس کے مطابق 2011 میں اخبارات اور جرائد کی تعداد 749 تھی جو 2019 میں کم ہو کر 707 رہ گئی۔ پنجاب میں روزنامہ اخبارات 102 سے گھٹ کر 42 رہ گئے؛ سندھ میں 44 سے محض 5۔ روزانہ کی اوسط سرکولیشن 2007 میں 99 لاکھ سے کم ہو کر اگلے سال 61 لاکھ پر آ گئی۔

گیلپ اینڈ گیلانی کے 2019 کے سروے کے مطابق پاکستان کے 75 فیصد لوگ کتابیں پڑھتے ہی نہیں، جبکہ صرف 9 فیصد خود کو باقاعدہ قاری قرار دیتے ہیں۔ باقی نے تحریری لفظ سے ناطہ توڑ لیا ہے۔

جو لوگ پڑھتے بھی ہیں وہ اکثر AI سے تیار شدہ تحریریں سوشل میڈیا کے کیپشنز، بلاگ پوسٹس اور مضامین پڑھتے ہیں۔ اس کے اثرات خاموش مگر گہرے ہیں : طلبہ انہی مصنوعی جملوں کے انداز کو اپنا لیتے ہیں، جس سے سوچ کا عمل بھی سطحی اور یکساں ہو جاتا ہے۔ بغیر اعلیٰ ادب کے مطالعے کے، زبان نقالی میں ڈھل جاتی ہے اور سوچ اپنی اصلیت کھو بیٹھتی ہے۔

جب مطالعہ مر رہا ہے تو تحریر بھی دم گھٹ رہی ہے۔ پاکستان کے لکھاری بغیر کسی ادبی ڈھانچے، سرپرستی یا قارئین کے کام کر رہے ہیں۔ ادبی رسائل تقریباً نہ ہونے کے برابر، پبلشرز رسک لینے سے گھبراتے ہیں اور قارئین ناپید ہیں۔ نوجوان لکھاری اپنی تحریریں سوشل میڈیا پر شیئر کرتے ہیں جو الگورتھم کے سمندر میں کچھ لمحوں بعد غائب ہو جاتی ہیں۔ بہت کم ایسے ہیں جو انسٹاگرام پوسٹس سے کتاب شائع کرنے کے مرحلے تک پہنچ پاتے ہیں۔

کتابیں مہنگی ہیں۔ کم از کم اجرت 37,000 روپے ہے اور 40 فیصد سے زائد افراد اس سے بھی کم کماتے ہیں، ایسے میں 3,000 سے 5,000 روپے کی کتاب ایک ضرورت نہیں بلکہ عیاشی بن جاتی ہے۔ سرکاری لائبریریاں نہ ہونے کے برابر ہیں، اسکول لائبریریاں بند یا خالی پڑی ہیں، اور بازاروں میں جعلی کتابوں کی فروخت عام ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکومت، سول سوسائٹی، پبلشرز اور خود لکھاری اس زوال کو پلٹ سکتے ہیں؟ کم مطالعے، کم آمدنی، کم سرپرستی اور ادبی حلقوں کی بندش کے باوجود؟ شاید نہیں جب تک کہ ایک جامع، شمولیتی اور عوامی حکمت عملی نہ اپنائی جائے۔

ریاست کو چاہیے کہ اگر کتابوں کی قیمت کم نہیں

کر سکتی تو ہر ضلع میں لائبریریاں قائم کرے، نصاب کو رٹنے کے بجائے مطالعے کے ذوق پر استوار کرے۔ کیونکہ ہم کسی کو زبردستی افلاطون، شیکسپیئر، بائرن، حافظ یا اقبال نہیں پڑھا سکتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی بندر کو کافی کا ذائقہ چکھانے کی کوشش کی جائے جس کی ذائقہ شناسی ابھی بیدار ہی نہیں ہوئی۔

ہمارے ادبی فیسٹیولز کارپوریٹ اور اشرافیہ کے زیرِ سایہ ہیں۔ یہ ثقافتی تقریبات اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن یہ کسی مطالعے کی تہذیب کا نعم البدل نہیں بن سکتیں۔ سچا ادب روشنیوں میں نہیں بلکہ لوگوں کے اجتماعی شعور میں جنم لیتا ہے وہ شعور جو پڑھتا ہے، سوال اٹھاتا ہے اور محسوس کرتا ہے۔ ادب کو اداروں کے قید خانے سے نکل کر عوام تک لوٹنا ہوگا بطور تجربہ، نہ کہ صرف تماشا۔

دنیا (اور خاص طور پر پاکستان) ایک ایسے بعد از خواندگی (post-literate) معاشرے کی طرف بڑھ رہی ہے جو وسطی دور کی ناخواندہ دنیا سے ملتی جلتی ہے۔ ایسے میں ادب کا کردار اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ لکھنا اور پڑھنا فکری زوال کے خلاف ایک چھوٹی مگر جرات مندانہ بغاوت ہے۔

پاکستان میں کمی صلاحیت کی نہیں، ادبی نظام کی ہے۔ جب تک ہم ایک ایسا کلچر نہیں بناتے جو کتاب کو رجحان پر، غور و فکر کو ردِعمل پر، اور فن کو دکھاوے پر ترجیح دے تب تک کسی پاکستانی کو نوبیل انعام ملنے کا خواب خواب ہی رہے گا۔

مگر خوابیں کسی نہ کسی جگہ سے شروع ہوتی ہیں: ایک لائبریری بنانے سے، ایک بک کلب قائم کرنے سے، یا ایک نظم بلند آواز میں پڑھنے سے۔ ہمیں مزید قاری و لکھاری برادریوں کی ضرورت ہے جیسے Dead Poets Society of Pakistan جو مطالعے کو زندہ کریں، بحث کریں اور نئے لکھاریوں کی سرپرستی کریں۔

مطالعے کا بخار لوٹ سکتا ہے اگر ہم اسے دوبارہ لگنے کا حوصلہ کریں۔

پروفیسر عاصم بخاری/میانوالی

افسانچے

نیک نامی

'' شگفتہ خیریت تو ہے آج آپ اداس اداس لگ رہی ہیں؟'' شوہر نامدار نے پوچھا

'' امی بیمار ہیں بس انہی کی فکر لگی ہوئی ہے''

''تو پھر کیا خیال ہے، ان کے ہاں چکر نہ لگا لیں''

''سوچتی ہوں انھیں کچھ دن اپنے ہاں لے آؤں''

"یہ بھی اچھا خیال ہے، اس میں پریشانی کیسی، جب کہیں گے لے آئیں گے ان کو اپنے گھر"

شوہر نے فراخ دلی سے کہا "لیکن"!...

"لیکن کیا؟

"سوچتی ہوں پھر عیادت کے لیے رشتہ دار آئیں گے۔ بچے ان کے ساتھ ہوں گے، دھما چوکڑی ہوگی۔ ان کی خاطر مدارت الگ۔۔۔"

شوہر۔۔۔ واہ، اس میں تنگ پڑنے والی کون سی بات۔۔۔ ماں کی خدمت اور مہمانوں کی خاطر داری سے خاندان بھر میں نیک نامی بھی تو ہوگی"

خدمت

"اکیلے میں کس سے باتیں کر رہی ہو۔۔۔؟

شوہر نے پوچھا

خود سے ہم کلام ہوں

"ارے، مگر وہ کیوں؟ خیریت تو ہے ناں"

"امی سخت بیمار ہیں، بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ سوچتی ہوں ان کو اپنے گھر لا کر کچھ روز اس کی خدمت کر لوں۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ کہیں حسرت نہ رہ جائے کہ کاش ان کی خدمت کر لیتے۔ بھابیوں سے تو امید نہیں ہے کہ وہ امی کا خیال رکھیں.

عابدہ بہن بھی پچھلے مہینے انکو اپنے گھر لے گئی تھیں۔ خوب خیال رکھا دعائیں لیں۔ سچ پوچھو تو مجھے بھی اس کی وجہ سے یہ خیال آیا کہ میں بھی خدمت میں پیچھے نہ رہوں"

"اس میں سوچنے کی کیا بات۔۔۔

ہمیں بھی خدمت کا موقع مل جائے گا۔ ساس بھی تو ماں ہی ہوتی ہے آخر۔ شوہر نے کہا

پھر اس کے دل میں ایک سرگوشی سے ابھری جو اس کی آنکھوں بھگوگئی۔

"یہ خیال تمھیں اپنی ماں کی باری پر بھی آتا تو بیٹی کے گھر نہ فوت ہوئی ہوتی"

✧✧✧

ارشد نذیر ساحل

بارسلونا، سپین

ہم نے دو پل بھی کبھی ساتھ گزارے کب تھے
اک گماں سا تھا فقط آپ ہمارے کب تھے
وہ تو، تو تھا کہ ہمیں تیرا بھرم رکھنا پڑا
ورنہ ہم لوگ کسی اور سے ہارے کب تھے
یہ بجا ہے کہ اِدھر آ کے نہ کچھ ہاتھ آیا
اُس طرف بھی مری قسمت میں ستارے کب تھے
تیرے آنے سے مناظر ہیں سبھی رنگ بھرے
تیرے بن آنکھ کو جچتے یہ نظارے کب تھے
یہ نصیبہ تو مرے گاؤں کے لوگوں ہی کا تھا
شہر میں تیرے بھلا ہجر کے مارے کب تھے
یہ تو چھلنی ہے مرا سینہ تری باتوں سے
تیر دشمن نے مرے دل میں اُتارے کب تھے
کتنے لوگوں سے تھا دن رات تعلق اپنا
ساتھ رہتے تھے مگر یار وہ سارے کب تھے
چارہ گر جس کو سمجھتے تھے ہمیں چھوڑ گیا
ساحلؔ اس دل کو زمانے کے سہارے کب تھے

✧✧✧

میلکم برابنٹ (انگلینڈ)-تعارف ورجینیا وولف

حسن عباسی/لاہور

ورجینیا وولف کی گمشدہ تحریروں کا مجموعہ ان کی وفات کے 80 سال بعد شائع۔

ایک حیران کن ادبی دریافت نے معروف برطانوی مصنفہ ورجینیا وولف کے قارئین کو خوش کر دیا ہے۔ وولف کی وفات کو 80 سال سے زیادہ گزر چکے ہیں، اور اسی ہفتے ان کی ایک نئی کتاب شائع کی گئی ہے۔ یہ کتاب تین مزاحیہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے پہلے ناول سے آٹھ سال قبل لکھی تھیں۔

یہ نایاب تحریریں لانگ لیٹ (Longleat) نامی برطانیہ کے ایک تاریخی محل کے کتب خانے میں چھپی ہوئی تھیں۔ اس محل میں 1300 سال پرانی تاریخی چیزیں محفوظ ہیں، اور ان کی نگرانی آرکاوسٹ ایما چیلی نور (Emma Challinor) کر رہی ہیں۔

ایما چیلی نور نے بتایا:

"یہ بالکل ویسا نہیں تھا جیسے کسی انڈیانا جونز فلم میں ہوتا ہے۔ ہمیں کوئی خفیہ سرنگ کھودنے یا جالوں سے لڑنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کتاب ایک شیلف پر رکھی تھی، ہمیں اس کے بارے میں علم تھا اور اس کا اندراج بھی تھا۔ لیکن اس کا اصل خزانہ اس وقت ظاہر ہوا جب محقق اُرملا سیشا گیری نے اس کے ادبی معنی پہچانے۔"

یہ دریافت دراصل پروفیسر اُرملا سیشا گیری (Urmila Seshagiri) نے کی، جو امریکا کی یونیورسٹی آف ٹینیسی، ناکسویل میں انگریزی اور ہیومینٹیز پڑھاتی ہیں۔

اُرملا نے بتایا:

"میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں چار سال سے اس تحریر کو دیکھنے کی منتظر تھی۔ جیسے ہی میں نے فائل کھولی، پہلے صفحے سے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک نیا اور اصلی کام ہے جسے وولف نے خود نظر ثانی کر کے مکمل کیا تھا۔ میں دنگ رہ گئی۔"

وولف نے یہ کہانیاں تقریباً 25 سال کی عمر میں لکھی تھیں۔ اُرملا کے مطابق:

"یہ مجموعہ ہمیں وولف کو ایک افسانہ نگار، سوانح نگار، ثقافتی نقاد اور نسائی مفکر کے طور پر بہتر طور پر سمجھنے کا موقع دیتا ہے۔ سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ نہایت مزاحیہ انداز میں لکھ سکتی تھیں۔"

جین گولڈمین (Jane Goldman)، جو وولف پر مستند کتاب The Cambridge Introduction to Virginia Woolf کی مصنفہ ہیں، کہتی ہیں:

"وولف ہمیشہ سے ایک علامتی اور باغی ادیبہ سمجھی جاتی ہیں ایک تجرباتی، نسائی اور امن پسند شخصیت کے طور پر۔"

وولف نے جنوبی انگلینڈ کے ایک دیہی گاؤں Rodmell میں قیام کیا۔ وہ 1941 میں 59 برس کی عمر میں ذہنی بیماری کے باعث خودکشی کر گئیں۔ اپنے آخری خط میں انہوں نے اپنے شوہر لیونارڈ وولف کو لکھا:

"مجھے یقین ہے کہ میں دوبارہ پاگل ہو رہی ہوں۔ ہم ایک اور خوفناک وقت برداشت نہیں کر سکتے۔ میں اس بار سنبھل نہیں پاؤں گی۔ آوازیں سن رہی ہوں، دھیان نہیں لگا سکتی، اس لیے میں وہی کر رہی ہوں جو مجھے درست لگتا ہے۔"

یہ خط لکھنے کے بعد وہ قریبی ریور اوز (River Ouse) میں ڈوب گئیں۔ ان کی لاش تین ہفتے بعد ملی۔

ماضی میں دنیا نے وولف کو ان کے ذہنی مرض کے باعث منفی نظر سے دیکھا۔ مگر آج ان کی تحریریں دنیا بھر کے لاکھوں قارئین کے دلوں کو چھو رہی ہیں۔ اُرملا کا کہنا ہے:

"لوگ اب بھی بعض اوقات انہیں غلط طور پر پاگل عورت کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن جو ان کا اصل کام پڑھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی تحریریں زندگی، خوبصورتی اور امید سے لبریز ہیں۔"

جین گولڈمین مزید کہتی ہیں:

"یہ تصور تو بنا لیا گیا کہ وہ ایک افسردہ مصنفہ تھیں، مگر جب آپ ان کا کوئی کام پڑھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس قدر زندہ دل، شوخ اور مزاحیہ انداز میں لکھتی تھیں۔ ان کا ابتدائی افسانوی کام شائع ہونا واقعی خوشی کا باعث ہے۔"

اُرملا کو یقین ہے کہ یہ کتاب آج کے نوجوان قارئین کے ساتھ گہرا تعلق پیدا کرے گی:

''وولف آزادیٔ اظہار، سوچ اور احساس کی جو وسعت دیتی ہیں، نوجوان اس سے فوراً جڑ جاتے ہیں۔''

یوں ورجینیا وولف کے ادبی ورثے میں ایک نیا خزانہ شامل ہو گیا ہے اور ایک بار پھر یہ ثابت ہوا کہ بڑے فنکاروں کی اصل قدر ان کے جانے کے بعد ہی سامنے آتی ہے۔

ورجینیا وولف جدید ادبیات کی علامتی شخصیت

ورجینیا وولف (Virginia Woolf) بیسویں صدی کی سب سے نمایاں، باغی اور تخلیقی ادیباؤں میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ 25 جنوری 1882ء کو لندن (انگلینڈ) میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اصل نام ایڈلین ورجینیا اسٹیفن (Adeline Virginia Stephen) تھا۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ، فکری اور ادبی گھرانے سے تھا، جس کی بدولت بچپن ہی سے انہیں اعلیٰ علمی ماحول میسر آیا۔

وولف ان مصنفین میں شامل ہیں جنہوں نے جدید انگریزی ادب کو ایک نیا فکری اور بیانیاتی رُخ دیا۔ وہ اسٹریم آف کانشسنیس (Stream of Consciousness) یعنی خیالات کے بہاؤ کے اسلوب میں تحریر کرنے والی اولین خواتین میں سے تھیں۔ یہ انداز قاری کو کردار کے ذہنی و باطنی سفر میں شریک کرتا ہے، اور ادب کو محض کہانی سے ایک فلسفیانہ اور نفسیاتی جہت عطا کرتا ہے۔

ادبی خدمات اور مشہور تصانیف:

ورجینیا وولف کا پہلا ناول The Voyage Out (1915ء) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے کئی شہرہ آفاق کتابیں لکھیں جن میں:

Mrs Dalloway (1925)

To the Lighthouse (1927)

Orlando (1928)

A Room of Ones Own (1929)

The Waves (1931)

ان کی تصنیف A Room of Ones Own (نسائیت Feminism) کی کلاسیکی تحریروں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے، جس میں انہوں نے عورت کے ادبی و فکری آزادی کے حق میں دلائل دیے۔

فکری و نسائی تحریک میں کردار

ورجینیا وولف صرف ایک ادیبہ ہی نہیں بلکہ فکری بیداری اور نسائی شعور کی علمبردار بھی تھیں۔ انہوں نے عورت کے لکھنے، سوچنے اور تخلیق کرنے کے حق پر زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی عورت کو اگر ادب میں کچھ نیا کہنا ہے تو اسے اپنا کمرہ اور مالی آزادی درکار ہے۔ یہی نظریہ آگے چل کر نسائی ادب کی بنیادوں میں سے ایک بن گیا۔

ذاتی زندگی اور ذہنی کیفیت

وولف نے لیونارڈ وولف (Leonard Woolf) سے شادی کی جو خود بھی ایک ادیب اور دانشور تھے۔ وہ دونوں مل کر Hogarth Press کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ چلاتے تھے، جہاں جدید ادب کے کئی اہم کام شائع ہوئے۔

تاہم وولف کی زندگی ذہنی دباؤ اور بیماریوں سے بھی نبرد آزما رہی۔ انہیں ڈپریشن کے شدید دوروں کا سامنا رہتا تھا۔ انہی مشکلات کے باعث انہوں نے 28 مارچ 1941ء کو خودکشی کر لی۔ ان کی وفات نے ادبی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، لیکن ان کا تخلیقی ورثہ آج بھی زندہ ہے۔

اجمل ساقی

ہر گھڑی تیرے دریچے پہ نظر ہوتی ہے
جب تری آنکھ کھلے، اس پل ہی سحر ہوتی ہے

چاند جب آئے تری زلف کے سائے سائے
رات اُس وقت بڑی خوب بسر ہوتی ہے

تیری سانسوں کی مہک پھول بناتی ہے سدا
خاک میں بھی تری خوشبوئے سفر ہوتی ہے

کوئی پل تیری جدائی میں گزر جائے اگر
زیست جیسے کسی طوفاں میں بھنور ہوتی ہے

جب ترا نام لبوں پر ہو، دعا بن جائے
تو نے آنا ہو تو جینے کی خبر ہوتی ہے

تیری آواز کی گرمی میں نشہ ہے کوئی
جب بھی تو بات کرے مست نظر ہوتی ہے

تیری آنکھیں جو ٹھہر جائیں کسی منظر پہ
زندگی تھم کے بھی جینے کا ہنر ہوتی ہے

تو جو آ جائے زمانہ بھی نیا لگتا ہے
ورنہ ہر شام بڑی بور ادھر ہوتی ہے

میں ترے شہر سے گزروں تو ہوا کہتی ہے
یہ وہی ہے جسے بس تیری خبر ہوتی ہے

ربط تجھ سے نہ تعلق نہ تعارف ہے ابھی
ہر خوشی تجھ سے ہی مربوط مگر ہوتی تھی

کافی کے گھونٹ میں گھلتا ہے ترے روپ کا رنگ
تو ہی سگریٹ میں سدا جان جگر ہوتی ہے

اب فقط جام چھلکتا نہیں اپنا ساقی
بات بے بات سدا آنکھ بھی تر ہوتی ہے

عشق میں طارق جاوید کا نیا قیام

منیر احمد راہی

طارق جاوید ایک ایسا نوجوان ہے جو مجھے ہر دم حیران کر دیتا ہے اور حیرت کی دُنیا میں گم ہو جاتا ہوں۔ پھر سوچتا رہتا ہوں پتہ نہیں اس میں طاقت کہاں سے آ جاتی ہے اور یہ کام کرتا رہتا ہے۔ گو میری اُستادی کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ لیکن اپنے ہر نئے کام سے مجھے آگاہ نہیں کرتا۔ لیکن میں نے کبھی اس کے ساتھ ناراض ہونا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ بلکہ اس ناطہ سے جڑے رہنے کو غنیمت سمجھا۔ اب مجھے بتاؤ کہ یہ کون سی اُستادی ہے کہ آپ سارا کام کریں اور پھر اچانک آ کر اُستاد کو حیران کر دیں۔ میرے خیال میں اسم اور منکشف کے اِس خالق نے میرے ساتھ کیا۔ بہت سی ایسی گفتگو جو اس کی زبان سے میں سنتا ہوں۔ اگر یہ کہیں میری کلاس میں ہوتا تو شاید بہت جلد میرے ساتھ ناراض ہو جاتا ہے۔ کیونکہ رسمی تعلیم کے معاملات کچھ اور ہوتے ہیں اور غیر رسمی تعلیم کے مراحل تو محبت اور پیار سے حل کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے میں نے اِس کے ساتھ محبت والا رویہ رکھا۔ لیکن جب بچے بڑے ہو جائیں تو کبھی کبھار اُن سے لڑ بھی لینا چاہئے۔ لیکن طارق جاوید ایسا نوجوان ہے کہ اس کے ساتھ لڑنے کو دل نہیں کرتا۔ بلکہ میرا دل کرتا ہے اِس کی حوصلہ افزائی کرتا رہوں۔ لیکن اب تو بات حوصلہ افزائی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ اور شاید میں اب سمجھتا ہوں کہ یہ کچھ باتیں بچی بھی کرتا ہے۔ انسان کو اپنی ضد چھوڑ دینی چاہئے۔ اور اِس کی باتیں تسلیم کر لینا چاہئے۔ کیونکہ جو اِس نے شاعری میں نیا موڑ لیا ہے۔ یہ بڑے حوصلہ کی بات ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں مذہب کے ساتھ انسان کی محبت ان کے خون میں رواں ہوتی ہے۔ جب اُس نے آنکھ ہی ایسے جہاں میں کھولی ہو جہاں چاروں طرف یہی الفاظ اُس کے ذہن میں محفوظ ہوں تو اس نے پھر وہی کام کرنے ہیں۔ اس لئے ارتباط کی شاعری بھی یہی اظہار کرتی ہے۔ کیونکہ طارق جاوید شاعری سے محبت کرتا ہے اور ہمہ وقت اسی جستجو میں ہوتا ہے، کسی طرح کوئی نیا مصرعہ بنایا جائے، کوئی نئی زمین تراشی جائے، کوئی اچھا شعر پڑھا جائے۔ میں خود حیران ہوتا ہوں یہ کس وقت ایسی خوبصورت شاعری تخلیق کرتا ہے۔ شاعری کی بجائے اس کے ذہن پر یہ سوار ہوتا ہے کہ اس غزل کی بحر کون سی ہے۔ اس کو کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال ان تمام باتوں کے باوجود جب میں نے ارتباط کا مطالعہ شروع کیا تو میں نے دیکھا اِس مجموعہ کی کون کون سی خوبی کو بیان کروں۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ جو طارق جاوید نے مستقبل کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ میں تو اِس پر خود حیران ہو رہا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اِس کو وہ تمام کام کرنے کی توفیق بھی دے نعت کے اِس شعر سے کس طرح اپنے آپ کو محترم کرتا ہے۔

کتنی غزلیں کہیں، کتنی نظمیں کہیں، نعت پہلی ہے یہ
میرا لکھا ہوا محترم ہو گیا نعت ہونے لگی

میں سمجھتا ہوں کہ بندہ وہی شاعری کی طرف آتا ہے۔ جو محترم اور عزت والا ہوتا ہے۔ شاعری انسان کو کیا عطا نہیں کرتی۔ یہی شاعری ہے جو مجبور کرتی ہے کہ طارق جاوید کی عزت کروں۔ ورنہ تو ہم اپنے مزاج کے آدمی ہیں۔ لیکن کیا کریں، ہمارا مزاج بھی شاعری سے جڑا ہوا ہے۔ شاعری کے حوالے سے جو گرم سرد باتیں ہمارے حصہ میں آئیں تھیں۔ وہ طارق جاوید کے حصہ میں نہیں آئیں۔ میں سمجھتا ہوں طارق جاوید کو شاعری نے مقام عطا کیا ہے۔

اس حمد میں اللہ تعالیٰ سے کس طرح دُعا کر رہا ہے۔

تو جانتا ہے مرے دل کا مدعا مالک
میں تھک گیا ہوں مرا حوصلہ بڑھا مالک
مرے نصیب کی تاریکیاں مٹانے کو
چراغ نور مجھے بھی تو کر عطا مالک

نجات کے لمحہ کو اِس طرح بیان کرتا ہے۔

ہے وہ لمحہ نجات کا لمحہ
جب میسر ہو نعت کا لمحہ
سبز گنبد پہ میری آنکھیں ہیں
مجھ پہ ہے اب ثبات کا لمحہ

ایک اور نعت کا شعر:

نبی کے پاس جو رہ کر نبی کا ہو نہ سکا
سو مشکلوں کا اُسے سامنا ضرور ہوا

میرے خیال میں اپنی زندگی کی داستان بیان کرتے ہوں طارق جاوید نے اپنی مشکلوں کا اظہار بھی کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس راہ میں کوئی بھی مشکل نہیں آ سکی اور وہ تمام مراحل طے کر رہا ہے جو ایک بہادر آدمی کرتا ہے اور طارق جاوید بہادر کیوں نہ ہوئے۔ وہ تو اُس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے جہاں بہادری بھی ایک مثال ہے۔ میں سمجھتا ہوں اُس نے وہ ذکر شروع کیا ہے۔ جو احباب کرتے بھی رہیں تو ختم نہیں ہوتا۔ یہ سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا اور پھیلا رہے گا۔ ایسے تو وہ نہیں کہتا۔

اے دوست کل جہاں کا وسیلہ حسینؑ ہے
جیسے نبی کی ذات ہے ویسا حسینؑ ہے
سجدے کو طول دے کے بتایا رسول نے
مجھ کو نماز جیسا ہی پیارا حسینؑ ہے

لوگوں کو آرا بھی اس نے حاصل کی ہیں۔ حالانکہ مجھے بھی یہ مضمون کیلئے کہتا رہا۔ لیکن میں نے ہاں بھی کی تھی لیکن پتہ نہیں کیا وجہ تھی کہ میں مضمون نہیں لکھ سکا۔ لیکن کتاب دیکھ کر میرے قلم نے پھر روانی پکڑ لی اور میں لکھنے بیٹھ گیا۔ چاہے جیسا بھی ہے، ہے تو میرا اپنا اس لئے چھوٹی موٹی بات کو درگزر کرنا چاہئے۔ اور طارق جاوید کی شاعری میں سفر کرنا چاہئے اس کو پڑھنا چاہیے اور حظ اٹھانا چاہیے سلام کے دو شعر دیکھئے۔

میں تیرے لہجے میں بولوں گی اے مرے بابا
علی سے وعدہ نبھایا علی کی بیٹی نے
جو حشر تک نہ بجھے گا کسی سے بھی طارق
دیا ہے ایسا جلایا علی کی بیٹی نے

کربلا والوں کی اس طرح تعریف کرتا ہے۔

اُس کی نسلوں میں کم نہیں ہوتا
جس کو دیتا ہے کربلا والا
مجھ کو مولا رضا کے صدقے میں
شعر ملتا رہے رضا والا

کربلا کی زمین سے کیسے گواہی مانگتا ہے۔

کربلا کی زمیں گواہی دے
دین کا ترجمان ہے شبیرؑ
خاک و خنجر گواہ ہیں طارق
رب کا روشن بیان ہے شبیرؑ

ہاں میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا یہ مجموعہ رثائی ادب کا ہے۔ لیکن ادب ادب ہوتا ہے چاہے جو ادب بھی ہو۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں یہ ایک خوبصورت اور متاثر کرنے والا مجموعہ ہے اللہ تعالیٰ اس کو اور برکت دے میری دعائیں طارق جاوید کے ساتھ ہیں وہ اسی طرح شعر کہتا ہے اور ہم میں موجود رہے۔

احمد ندیم رفیع
امریکا

شہرِ نگارشات میں جب شام ہو گئی
چشمِ خیال رات کا آنچل بھگو گئی

سر بھی اٹھا نہ پائی تھی یک آرزوئے وصل
پائے نگاہِ ناز سے پامال ہو گئی

شاید شبِ وصال کا آنا ٹھہر گیا
خلوت کدے میں ایک حسیں شام ہو گئی

کس نے کہا تھا یوں مرے پہلو میں آ کے بیٹھ
تر چشمگی مری ترا دامن بھگو گئی

دستِ صبا کی کاریگری بھی کمال تھی
تارِ سخن میں درد کے موتی پرو گئی

اک آرزوئے شوق تھی، بھڑکی تمام رات
اور پھر چراغِ صبح کی مانند سو گئی

اس کی نگاہ پڑنے سے پہلے ہی چشمِ تر
چہرے پہ جو لکھی تھی وہ تحریر دھو گئی

بیٹھی تھی آ کے تیرے مقابل میں زندگی
اور پھر کسی حسین تصوّر میں کھو گئی

یوں تو پلٹ گئی وہ اُچٹتی ہوئی نگاہ
سینے میں ایک بیج محبت کا بو گئی

✧✧✧

انجینئر ظفر محی الدین
لاہور

فرہاد کے بدن پہ پسینہ ہے عشق کا
ہے پربتوں کے سامنے، سینہ ہے عشق کا

صحرا ہے آئینے کی طرح قیس کے لیے
لیلیٰ کو دیکھنے میں قرینہ ہے عشق کا

طوفان کا ہے ڈر نہ بھنور کا ہے کوئی خوف
ہم جس میں بیٹھے ہیں وہ سفینہ ہے عشق کا

اُس سے زیادہ کوئی نہیں معتبر یہاں
جس کی انگوٹھی میں بھی نگینہ ہے عشق کا

کچھ اس لیے بھی تاج محل بے مثال ہے
زندہ رہے گا کیونکہ دفینہ ہے عشق کا

انعام ان کو ہم تو سمجھتے ہیں عشق میں
آنسو نہیں ہیں دوست خزینہ ہے عشق کا

عشاق سارے رہتے ہیں اس میں ہر اک جگہ
شہرِ نبیؐ تو سارا مدینہ ہے عشق کا

عشاق جاگ کر ہی گزاریں ہیں ساری رات
جو ہجر کی ہے شب وہ شبینہ ہے عشق کا

کہتے ہیں جس کو لوگ محرّم سبھی ظفر
میں تو یہی کہوں گا مہینہ ہے عشق کا

✧✧✧

بقیہ انٹرویو: دانش نقوی

ارژنگ: کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

دانش نقوی: ایک شاعر کو شعر کہنے کی تحریک کہیں سے بھی مل سکتی ہے وہ کوئی منظر ہو سکتا ہے کوئی سفر ہو سکتا ہے یا کوئی بھی ایسی چیز جس کو شاعر اپنے خیالات اور جمالیاتی پیمانوں کے مطابق ہوتا پائے شاعری کا محرک ہو سکتی ہے

ارژنگ: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

دانش نقوی: کتاب اور اخبار کی طرح سوشل میڈیا بھی صرف ایک میڈیا ہے لیکن اس کی خطرناک بات یہ ہے کہ یہاں آپ کچھ بھی کر کے مشہور ہو سکتے ہیں اس پہ کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے جو کہ خطرناک صورتحال ہے

ارژنگ: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ھیں؟

دانش نقوی: میرے نزدیک ذاتی تجربات اور مشاہدات وغیرہ شعر کے بنیادی ماخذ ہیں

ارژنگ: کیا کھویا کیا پایا؟

دانش نقوی: تنہائی کھوئی اور اس کے بدلے میں جو بھی پایا وہ کم ہے

ارژنگ: آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

دانش نقوی: آج کل شاعری لکھ رہا ہوں۔۔ مستقبل کا منصوبہ شاعری ہے اور ارادہ بھی شاعری ہے۔

منتخب کلام دانش نقوی

ماحول مناسب ہو تو اوپر نہیں جاتے
ہم تازہ گھٹن چھوڑ کے چھت پر نہیں جاتے

دیکھو مجھے اب میری جگہ سے نہ ہلانا
پھر تم مجھے ترتیب سے رکھ کر نہیں جاتے

بدنام ہیں صدیوں سے ہی کانٹوں کی وجہ سے
عادت سے مگر آج بھی کیکر نہیں جاتے

جس دن سے شکاری نے ادا کی کوئی منت
دربار پہ اس دن سے کبوتر نہیں جاتے

سو تم مجھے حیرت زدہ آنکھوں سے نہ دیکھو
کچھ لوگ سنبھل جاتے ہیں سمر نہیں جاتے

یوں بھی آنکھوں میں کسی خواب کا ریشہ نہ بنے
کوئی پہچان نہ ہو ٹھیک سے چہرہ نہ بنے

ایسی تصویر بنا روتے ہوئے خوش بھی لگوں
غم کی ترسیل تو ہو غم کا تماشہ نہ بنے

مستحق ہوں تو کسی اور سے تصدیق بھی کر
مجھ کو مت دینا اگر میرا دلاسہ نہ بنے

جتنا پختہ بھی ہو دل جسم سے باہر رکھنا
تاکہ ٹوٹے بھی تو پھر سینے میں ملبہ نہ بنے

بس اسی شرط پہ کوئی بھی رہے آنکھوں میں
نیند کی سمت کسی خواب کا رستہ نہ بنے

جو بھی رشتہ ہو فقط میرا ہو تجھ سے دانش
اور تو اور ترا مجھ سے بھی رشتہ نہ بنے

سب لوگ کہانی میں ہی مصروف رہے تھے
دراصل اداکار حقیقت میں مرے تھے

جاتے ہوئے کمرے کی کسی چیز کو چھو دے
میں یاد کروں گا کہ ترے ہاتھ لگے تھے

آنکھیں بھی تری فتح نہ کر پائے ابھی تک
کس لمحۂ بیکار میں ہم لوگ بنے تھے

ہم یوں ہی کسی بات کو دل پر نہیں لیتے
نقصان زیادہ تھے سو گھبرائے ہوئے تھے

اتنا ہی بتا سکتا ہوں احباب کے بارے
کچھ تیر مری پشت کی جانب سے چلے تھے

میں نے تو کہا تھا کہ نکل جاتے ہیں دونوں
اس وقت کہانی میں سبھی لوگ نئے تھے

باندھ لی جاتی کمر کاٹ دیے جاتے تھے
سبز ہوتے ہی شجر کاٹ دیے جاتے تھے

اب کہیں جا کے نظر آیا ہے گاؤں میرا
پہلے نقشے سے یہ گھر کاٹ دیے جاتے تھے

عمر ہی کاٹی ہے تم نے یہ بڑا کام نہیں
اس کے کہنے پہ تو سر کاٹ دیے جاتے تھے

دستکیں دیتے ہوئے لوگوں کو معلوم کہاں
پہلی دستک پہ ہی در کاٹ دیے جاتے تھے

موسموں سوچتے رہتے تھے فضا کے بارے
اڑنا آتا تھا تو پر کاٹ دیے جاتے تھے

بقیہ انٹرویو: انور ندیم علوی

ارژنگ: اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

انور ندیم علوی: اجداد کا تعلق تحصیل گڑھ شنکر ضلع ہوشیار پور انڈیا سے تھا جو کہ قریباً آج سے ایک سو سال قبل چیچہ وطنی ضلع ساہیوال آ گئے۔ 1935ء میں بزرگوں نے دریا خان مری ضلع نواب شاہ سندھ میں زرعی زمین خریدی۔ خاکسار 1952ء میں نواب شاہ سندھ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم سندھی میں یہیں سے حاصل کی۔ L.L.B لاہور سے کیا اور 1976ء میں نواب شاہ میں وکالت کے ساتھ ساتھ خاندان کی زرعی اراضی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھالی۔

ارژنگ: ادب کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

انور ندیم علوی: سن 80ء کی دہائی میں نواب شاہ میں ادبی سرگرمیاں عروج پر تھی۔ سندھی اردو مشاعرے ہوتے۔ امیر مینائی کے ادبی سلسلہ کے وارث سلیم شاہجہان پوری کے پاس ہر وقت نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا جھرمٹ لگا رہتا۔ خاکسار کو ان سے اصلاح لینے کا موقع ملا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے باقاعدہ تقریب میں خاکسار کو اپنا ادبی جانشین مقرر کیا۔

ارژنگ: پہلا شعر کب کہا؟ اور ادب میں کب پذیرائی حاصل ہوئی؟

انور ندیم علوی: اس وقت ذہن میں نہیں۔ نواب شاہ میں سندھی اور اردو دونوں حلقوں میں نمائندگی رہی۔ شیخ ایاز کی سندھی شاعری کے منظوم اردو اور پنجابی تراجم کی وجہ سے بہت پذیرائی ملی۔

ارژنگ: پہلا مشاعرہ کب پڑھا اور پہلا مجموعہ کب شائع ہوا؟

انور ندیم علوی: پہلا مشاعرہ تو یاد نہیں۔ بے شمار مشاعرے پڑھے۔ پہلا مجموعہ ''جاگتی آنکھوں کے خواب'' 1980ء میں شائع ہوا جسے ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔

ارژنگ: آپ کی اب تک کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟ کیا ان کی حکومتی یا عوامی سطح پر پذیرائی ہوئی؟

انور ندیم علوی: اردو، پنجابی، سندھی تراجم، نظم، نثر، کالم اور مضامین کی 20 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ 10 کتب اشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہیں اور ایک درجن زیرِ ترتیب ہیں۔ 1997ء میں گولڈن جوبلی مشاعرے سرکاری سطح پر منعقد ہوئے۔ سکرنڈ میں جناب پروفیسر عنایت علی خاں نے میرے مصرعہ

ع یاد کے گلدان میں تازہ تھے چاہت کے گلاب
جاگتی آنکھوں کا سپنا آج بھی ٹوٹا نہ تھا

''کیا بولتا ہوا مصرعہ ہے'' کہہ کر داد دی اور اسٹیج سے مکرر مکرر کی آوازوں نے بہت دیر تک مسحور کیے رکھا۔

ارژنگ: اب تک آپ نے کتنی زبانوں میں شاعری کی ہے؟

انور ندیم علوی: خاکسار اُردو، پنجابی اور سندھی میں شاعری کر رہا ہے۔ ویسے تراجم انگریزی، عربی، بنگالی اور سرائیکی زبانوں سے بھی کیے ہیں اپنی قومی زبان اردو میں شاعری نسبتاً زیادہ پسند ہے۔

ارژنگ: کن اصناف میں لکھ رہے ہیں؟

انور ندیم علوی: نظم، نثر، اخباری کالم، مضامین اور طنز و مزاح۔ ان میدانوں میں قلم خوب چلتا ہے منظوم تراجم نے بہت عزت اور شہرت بخشی۔ افسانے اور ناول کی طرف رجحان بہت کم ہے۔ البتہ ادبی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ ہے۔ میرا پیغام شاعری میں یہ ہے:

پیار انسان سے عبادت ہے
اپنا مسلک میں عام کرتا ہوں

ارژنگ: کیا آپ مشاعروں کے حق میں ہیں یا خلاف؟

انور ندیم علوی: مشاعروں کی خوبیوں خامیوں پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ تاہم ''کھیلنا نہ کھیلنے سے بہرحال بہتر ہے'' کے مطابق مشاعرے ہوتے رہیں تو اچھا ہے۔

ارژنگ: ادب کی ترویج کے لیے جو ادارے کام کر رہے ہیں کیا آپ ان کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

انور ندیم علوی: ادب کی ترویج کے لیے ادارے جو کام کر رہے ہیں اور جو ایوارڈ تقسیم کیے جاتے ہیں اُن میں پسند اور ناپسند کی بنیاد پر غلطیاں ہوتی رہتی ہیں ناانصافیوں کے ساتھ ساتھ کسی حد تک جائز حقدار کو بھی صحیح ایوارڈ مل جاتا ہے مگر مسئلہ یہ بھی ہے کہ ایوارڈ تقسیم کرنے والے کا پیمانہ الگ ہو سکتا ہے۔

ارژنگ: ادب برائے ادب کے قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کے؟

انور ندیم علوی: ''ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی'' کی بہت پرانی بحث میں اُلجھے بغیر اتنا ضرور کہوں گا ''ادب وہی ہے جو زندگی سنوارے''

ارژنگ: کبھی بیرونِ ملک مشاعرہ پڑھنے کا اتفاق ہوا؟

انور ندیم علوی: متعدد مرتبہ بیرونِ ملک مشاعرے پڑھنے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ 1997ء میں ہنسلو U.K میں گولڈن جوبلی مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا۔ جناب بخش لائل پوری، ڈاکٹر سعادت سعید اور دیگر شعراء سے ملاقات ہوئی۔ 2024ء میں آسٹریلیا میں میرے اعزاز میں ایڈیلیڈ اور سڈنی میں مشاعرے ہوئے۔ ایڈیلیڈ کا مشاعرہ تو آسٹریلیا میں منفرد مشاعرہ

تھا کیونکہ اس میں اردو، پنجابی اور سندھی زبان میں شاعری پڑھی گئی۔ شمی جالندھری، پنجابی شاعر، ندیم شاد انڈیا کے اردو شاعر اور کاشف بٹ سے ملاقات بہت مفید رہی۔

ارژنگ: ادبی کام کے اعتراف میں کبھی ایوارڈ سے نوازا گیا؟

انور ندیم علوی: ایوارڈ اللہ کا فضل ہے کافی مل چکے ہیں۔ بی ایس اور ایم ایس کے تین مقالہ جات میری کتب اور شاعری پر ہو چکے ہیں۔ نواب شاہ سندھ کے دور دراز علاقے سے اُٹھ کر لاہور کے ادبی حلقوں میں جگہ بنانا بذاتِ خود بہت اہم ہے۔

ارژنگ: کچھ کراچی اور سندھ کے ادبی حوالے سے کہیں گے؟

انور ندیم علوی: کراچی سندھ کا دارالحکومت ہے۔ اہل کراچی تو خود کو اہلِ زبان سمجھتے ہیں۔ باقی اندرون سندھ تو سندھی ادب شاہ عبداللطیف بھٹائی اور شیخ ایاز کی شاعری کے سلسلے میں ہی چل رہا ہے۔

ارژنگ: کس کی شاعری نے متاثر کیا؟

انور ندیم علوی: مجھے شیخ ایاز کی شاعری نے بے حد متاثر کیا ہے۔ میری کتاب ”تاج سجے تعزیروں کے“ ایاز کی شاعری کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ نیز ”تھل ترہیائے نین“ شیخ ایاز کی شاعری کے منظوم پنجابی تراجم پر مشتمل ہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ایاز کی ”غزلوں“ کا منظوم پنجابی ترجمہ صرف میں نے ہی کیا ہے کسی اور نے نہیں۔

ارژنگ: مستقبل میں کون سے کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں؟

انور ندیم علوی: آئندہ آنے والی کتب میں ”دھنک رنگ شاعری“ (ساٹھ زبانوں کے منظوم تراجم) ”داستانِ شعر و ادب“ (ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کا احوال) ”مہران موتی مولا“ (سندھی دوستوں کی شاعری اور تراسیم) ”جامِ مینا“ (فکر مینائی کے حامل سلیم شاہجہان پوری کے شاگردوں کا تذکرہ) نیز ادبی آپ بیتی کے علاوہ بھی ادبی کام زیر ترتیب ہے۔

ارژنگ: ماہنامہ ”ارژنگ“ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

انور ندیم علوی: ماہنامہ ”ارژنگ“ نیز دوسرے ادبی رسائل کا مطالعہ اتنا ہی اہم ہے جتنا انسانی جسم کے لیے صاف اور صحت مند غذا۔

نیز تمام قارئین ارژنگ سے گزارش ہے کہ وہ اپنی اپنی سطح پر میرٹ کو رواج دیں۔ قائداعظم اور علامہ اقبال کے اصولوں کو اپنا کر ہی ملک اور ادب کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ علم و ادب کو بھائی چارے اور محبت کے لیے ایک وسیلہ بنا کر ہی پاکستان کو ترقی کی راہ پر ڈالا جاسکتا ہے۔ ارژنگ کی یہ پالیسی لائق تحسین ہے کہ وہ دور دراز شہروں اور نسبتاً غیر معروف ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویو اور کلام کا اہتمام کرتا ہے۔ تاکہ ملک عزیز کے شاعروں اور ادیبوں کے کام سے دوسرے ادیب واقف ہوں۔ یہ کام ادبی اور ملکی ہم آہنگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ آخر میں ادارہ ”ارژنگ“ کا شکریہ جس نے نواب شاہ سندھ سے تعلق رکھنے والے ادیب و شاعر کو لاہور کے ادبی حلقوں سے متعارف کرایا۔

انور ندیم علوی مشاہیر کی نظر میں

میرے ہم تخلص انور ندیم علوی ایک عمدہ غزل گو ہیں۔ انہوں نے شیخ ایاز کی سندھی شاعری کے جو تراجم کیے ہیں وہ متعدد جہات سے لائق تحسین ہیں۔ اول تو سندھی کے ایک اہم شاعر کی نظریۂ حیات وفن میں بڑی جان ہے اور اس سے ہر پاکستانی کو پوری طرح متعارف ہونا چاہیے۔ دوم ندیم علوی کے یہ تراجم اتنے معیاری اور سچے ہیں کہ اُن پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ شاعری کے تراجم میں قدرتی طور پر جو اجنبیت سی در آتی ہے، وہ ان تراجم میں مفقود ہے اور میری رائے میں ندیم علوی نے ان تراجم کے ذریعے شعر و ادب کی تاریخ میں اپنے نام کی شمولیت کا نہایت جائز جواز پیش کر دیا ہے۔ ان کی اوریجنل غزل بھی جدید اور عصرِ حاضر کی نمائندہ ہے۔ **(احمد ندیم قاسمی)**

انور ندیم کے کلام میں اس بات کی پوری شہادت موجود ہے کہ وہ امکانات سے بھرپور ذہن کا مالک ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی شاعری میں مبتدیوں جیسے نقائص نہیں پائے جاتے اور یہ شاعری کے تقاضوں سے پوری طور پر ہتھیار بند ہے۔ ہمعصر شاعری میں اس کی مساعی کیا کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ سراسر اس کی توفیق اور ہمت کے علاوہ اس بات پر بھی منحصر ہے کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوصف، شاعری کو وقت کتنا دے سکتا ہے کیونکہ وکالت اور شاعری دونوں ہی کُل وقتی مصروفیات ہیں۔ **(ظفر اقبال)**

انور ندیم علوی ایک نظریاتی شاعر ہیں، بھگتی تحریک سے ترقی پسند تحریک تک، جن تحریکوں نے انسانوں کو درد کے رشتے سے پہچانا ہے۔ انور ندیم علوی کی شاعری اسی رشتے کو گہرا اور مضبوط کرتی ہے۔

انور ندیم علوی نے شیخ ایاز کا ترجمہ کیا ہے جو ان کے نظریے اور روایت کی نشاندہی کرتا ہے۔ شیخ ایاز کی شخصیت اور افکار لطیف بھٹائی سے بھلے شاہ تک ایک ایسے نظریے کا اظہار ہے جس میں انسانوں کو توڑنے کی بجائے آپس میں جوڑنے کا پیغام ملتا ہے۔ انور ندیم علوی کی شاعری کا مجموعی پیغام بھی یہی ہے۔ کیا ہم اُن کے اس پیغام کے لیے شکرگزار نہیں ہوں گے؟ **(نذیر قیصر)**

منتخب غزلیں انور ندیم علوی

ہر خزاں دیدہ کو گلزار کیا ہے میں نے
زندگی! تجھ کو بہت پیار کیا ہے میں نے

سر جھکانے کے عوض شاہ عنایت کر دے
ایسی دستار سے انکار کیا ہے میں نے

پیار انسان سے ہے جرم تو منصف سن لے
گرم اسی جرم کا بازار کیا ہے میں نے

'حق' ہے بولی مری 'منصور' قبیلہ میرا
یہی اعلان سرِ دار کیا ہے میں نے

جس کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے ساری محفل
آج اسے مائلِ گفتار کیا ہے میں نے

جو بھی اُس چاند کو چاہے، اُسے چاہو تم بھی
چاند چہروں سے بہت پیار کیا ہے میں نے

چشمِ خوابیدہ کو اس پیار کی شبنم سے ندیمؔ
کتنے ارمانوں سے بیدار کیا ہے میں نے

....

کتنی بدلی سارے گلشن کی فضا؟ کیسے کہوں
اڑ گئی امن و سکوں کی فاختہ، کیسے کہوں

بے اماں ہیں سب پرندے کیا ہوا، کیسے کہوں
ہم صفیرو! آشیاں کیوں کر جلا، کیسے کہوں

گھٹتے گھٹتے مٹ گیا انسان کا سایہ، مگر
بڑھتے بڑھتے بن گئے بندے خدا، کیسے کہوں

ایک منزل، راستے بھی ایک تھے اپنے کبھی
دو دلوں میں بڑھ گیا پھر فاصلہ، کیسے کہوں

کوئی خوشبو ساتھ چلتی ہے سدا جیسے نسیم
جو بسا ہے روح میں اس کو جدا کیسے کہوں

بے وفا محبوب جیسی زندگی انور ندیمؔ
رُوٹھ کر چل دی اچانک، کیا ہوا، کیسے کہوں

....

قتیلِ عشق جب جاں سے گزرتا ہے تو لکھتا ہوں
کوئی گہرے سمندر میں اترتا ہے تو لکھتا ہوں

دہکتی آگ کو گلزار بھی ہوتے ہوئے دیکھا
کوئی نمرود جب حد سے گزرتا ہے تو لکھتا ہوں

کھلا ہوں دامنِ صحرا میں خوشبو کون دیکھے گا؟
شکایت جب صبا سے پھول کرتا ہے تو لکھتا ہوں

خلوصِ دل سے ہوتے ہیں معطر ریشمی وعدے
اچانک جب کوئی ان سے مکرتا ہے تو لکھتا ہوں

بڑا پرکیف منظر ہے جہانِ رنگ و بو ہمدم
سہانا خواب لیکن جب بکھرتا ہے تو لکھتا ہوں

سفر میں ہیں ہزاروں ہی مسافر دیکھ لو لیکن
کوئی دل کی گلی سے جب گزرتا ہے تو لکھتا ہوں

بہاروں سا، ندیمؔ انور! معطر نام ہے اس کا
وہ جب خوشبو مرے شعروں میں بھرتا ہے تو لکھتا ہوں

....

جھوٹ، نفرت کبھی نہیں لکھنا
خوب صورت سدا حسیں لکھنا

چاند جھومر ہے اس کے ماتھے کا
مہ جبیں کو ہی مہ جبیں لکھنا

جھیل آنکھوں سے جب ملیں آنکھیں
ہم نے سیکھا غزل وہیں لکھنا

دل بھی خالی مکان ہے گویا
کوئی آیا نہیں مکیں، لکھنا

کشتِ ویراں میں پیار کی رم جھم
دل کو آتا نہیں یقیں لکھنا

خواب، خوشبو، خیال کی باتیں
غیر ممکن ہے ہر کہیں لکھنا

....

اس سہانی رات کا منظر مجھے بھولا نہ تھا
چاند بادل سے گلے مل کر جدا ہوتا نہ تھا

یاد کے گلدان میں تازہ تھے چاہت کے گلاب
جاگتی آنکھوں کا سپنا آج بھی ٹوٹا نہ تھا

دوریاں، مجبوریاں، تھی گردشِ دوراں مگر
گلشنِ الفت کا کوئی پھول مرجھایا نہ تھا

دل کے دروازے پہ دستک رات بھر ہوتی رہی
کوئی اپنا تھا کہ سپنا راز یہ کھلتا نہ تھا

شعلہ و شبنم کو تو نے کر دیا یکجا ندیمؔ
تیرے اس اعجاز کو لیکن کوئی سمجھا نہ تھا

....

نامکمل زندگی کا سارا نقشہ رہ گیا
عشق گو بے لوث تھا لیکن ادھورا رہ گیا

خود سے بھی کیسے ملے اب وقت کتنا رہ گیا
کاروبارِ زیست میں انسان تنہا رہ گیا

کوئی منطق جانے والوں کو نہ قائل کر سکی
بھیگی پلکوں پر مچلتا ایک دریا رہ گیا

آندھیاں غم کی چلیں ایسی مٹے نقشِ وفا
اک تنے پہ میرا اس کا نام لکھا رہ گیا

دل، دماغ اور سوچ میں وہ لمحہ لمحہ تھا شریک
اس کے جاتے ہی جہاں سے میں بھی آدھا رہ گیا

پیار کی خاطر یہ کس نے چھوڑ دی دنیا ندیمؔ
میں تو تھا ہی دم بخود سارا زمانہ رہ گیا

....

نادیدہ

عالیہ ذوالقرنین

بارش کا ایک ایسا سلسلہ شروع تھا جو رک کے تو بھی محسوس ہوتا رہے۔ کھڑکی کے شیشوں پر قطرے پھسلتے تو پانی کی ایک لائن سی بن جاتی۔ پہلی بار اس کا میسج آیا تھا۔

"ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گی؟ آپ بہت مقدس لگتی ہیں"

یہ پہلا جملہ تھا، جیسے کوئی اجنبی سڑک کے بیچ آ کر دھیرے سے کان میں سرگوشی کرے۔ میں نے ایک مختصر سا جواب دیا، محض رسمی۔ مگر وہ رکا نہیں۔ اگلے دن وہ پھر موجود تھا "میرا ایک تخیل ہے جو میں عام لوگوں سے شیئر نہیں کر سکتا عجیب لگتا ہے، مگر آپ سنیں گی؟ مجھے لگتا ہے کہ آپ مجھے سمجھ سکتی ہیں شروع میں ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھی تھوڑا عجیب لگے مگر سنیں گی تو سمجھ جائیں گی۔" میں نے محض سوالیہ نشان بھیج دیا کیونکہ مجھے چاہ کر بھی اس کی مجھ سے راہ طے کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی۔

"میں خود کو بکرا سمجھتا ہوں قربانی کا بکرا اور میں خود کو کسی مقدس ہستی کے ہاتھوں ذبح کروانا چاہتا ہوں مجھے ایک مقدس ہستی نہیں مل رہی لیکن اب لگتا ہے کہ میری تلاش ختم ہو گئی ہے آپ ہی وہ مقدس شخصیت ہیں جو مجھے ذبح کرے گی۔"

میرے اندر ہنسی اور گھبراہٹ کے دو احساسات ایک ساتھ جاگے، میں ہنسنا چاہتی تھی، مگر اس جملے کے پیچھے کچھ ایسا تھا جو محض مذاق نہیں تھا۔ الفاظ میں ایک سنجیدگی، ایک عجیب سا احترام۔

اگلے کئی دن وہ باتوں کو اس ایک سمت میں لے جاتا۔ کبھی اپنے بچپن کا ذکر کرتا جب گلی کے نکڑ پر قربانی کے دن بکرے بندھے ہوتے اور وہ گھنٹوں انہیں دیکھتا۔ کبھی کہتا، "میں نے ہمیشہ سوچا کہ کسی دن میں بھی انہی میں شامل ہوں گا۔"

میں ہر بار بات بدلنے کی کوشش کرتی، مگر اس کا مجھ سے رابطے کا ایک ہی مقصد تھا اس لیے وہ پھر کسی نہ کسی بہانے سے وہیں لوٹ آتا۔

"آپ جانتی ہیں کہ بکرا ذبح ہونے سے پہلے بھی خوش رہتا ہے اور آپ کے ملنے کے بعد میں بھی بہت خوش ہوں ذبح کا وہ لمحہ وہ میرا سکون ہے میں اس سکون کو حقیقت میں محسوس کرنا چاہتا ہوں"

یہ مکالمے چھوٹے چھوٹے ہوتے، مگر دن بدن بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ مجھے "مقدس صاحبہ" کہہ کر پکارنے لگا۔ میں نے کہا، "یہ سب تم مجھے ہی کیوں بتاتے ہو؟"

"کیونکہ آپ مجھے سنتی ہیں آپ نے کبھی میرا مذاق نہیں اڑایا آپ نے کبھی یہ سب سننے سے انکار نہیں کیا۔" وہ لہجے میں احترام سموتے ہوئے بولا۔

تیسرے ہفتے کی ایک رات وہ زیادہ دیر تک آن لائن رہا۔ آج بھی کھل کر بارش ہوئی تھی جو اب رک چکی تھی مگر فضا میں پانی کی مخصوص خوشبو باقی تھی۔ وہ بولا "میں چاہتا ہوں آپ ایک کہانی لکھیں ہم کردار ہوں۔ آپ، ایک مقدس ہستی جو مجھے ذبح کرنے والی ہے اور میں بکرا۔" میں نے کہا، "یہ سب تخیل ہے نا؟"

وہ ہنس پڑا، "ہاں، مگر تخیل کبھی کبھی حقیقت سے زیادہ سچا ہوتا ہے۔"

اس رات اس نے تفصیل سے بتایا کہ بکرا کیسے دیکھتا ہے، کیسے محسوس کرتا ہے، کیسے وہ اپنے مقدر کو قبول کرتا ہے۔ اس کے الفاظ میں ہر طرح کا سکون تھا، جیسے کوئی اعتراف کر رہا ہو۔

کچھ دن بعد اس نے مجھے اپنا خواب سنایا۔ "میں ایک کھلے میدان میں ہوں، سفید دھند پھیلی ہے آپ آہستہ آہستہ قریب آ رہی ہیں آپ کے ہاتھ میں چھری ہے، مگر آپ کی آنکھوں میں خوف نہیں، محبت ہے۔ میں جھک جاتا ہوں آپ کے جوتوں پر لگی مٹی کو اپنی زبان سے چاٹ کر صاف کرتا ہوں آپ کو تقدس بھری نظروں سے دیکھتا ہوں اور۔۔۔"

وہ بات ادھوری چھوڑ دیتا، جیسے چاہتا ہو کہ میں خود اسے مکمل کروں۔ میں خاموش رہتی مگر اس خاموشی نے بھی شاید اسے حوصلہ دیا۔

چوتھے ہفتے ایک عجیب سا سکوت ہماری چیٹ میں در آیا۔ وہ دن بھر غائب رہتا اور رات کو ایک ہی جملہ بھیجتا، "کیا آج وہ دن ہے؟" میں کہتی، "کون سا دن؟" وہ لکھتا، "قربانی کا دن۔" میری انگلیاں کی بورڈ پر رکی رہتیں۔ میں محسوس کرتی تھی کہ یہ محض کسی بیمار ذہن کا کھیل نہیں تھا بلکہ ایک طویل دباؤ، ایک ایسی نفسیاتی گتھی جو خود کو فینٹسی کے دھاگوں میں لپیٹ چکی تھی۔

پھر ایک رات، شاید وہ جمعرات تھی اس نے کہا، "چلیں، آج کہانی مکمل کرتے ہیں۔" میں نے جواب دیا، "ٹھیک ہے لیکن یاد رکھو، یہ سب تخیل ہے۔"

اس نے لکھا، "تخیل میں ہی تو ہم سب سچ بولتے ہیں۔"

اس کے الفاظ کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ مجھے منظر بتانے لگا۔

"اندھیری رات ہے چاروں طرف خاموشی میں ایک رسی سے بندھا ہوں۔ آپ آہستہ آہستہ قریب آ رہی ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں چمکتی چھری ہے اور میں خوش ہوں۔"

میں نے اس کہانی کو اپنی انگلیوں سے ٹائپ کرنا شروع کیا۔ ہر جملہ ایک حقیقت کی طرح بھیجا۔ وہ جواب میں "ہاں" لکھتا رہا، جیسے ہر لفظ اس کے تخیل

کونئی زندگی دے رہا ہو۔

میں اب تھک چکا ہوں۔ زمین ٹھنڈی ہے اور رسی میرے پاؤں کے گرد زم مگر مضبوطی سے لپٹی ہے۔ دور کہیں کسی کی سانس سنائی دے رہی ہے آہستہ مگر اندر اترتی جیسے کوئی دعا پڑھ رہا ہو۔ میں جانتا ہوں وہ آپ ہیں میری مقدس ذبح کرنے والی ہستی۔۔ میں سر جھکا لیتا ہوں۔ اس لمحے میری دنیا چھوٹی ہو کر محض آپ کے قدموں تک سمٹ گئی ہے۔ آپ قریب آتی ہیں تو میں آپ کی خوشبو پہچان لیتا ہوں۔۔ وہی خوشبو جو میں اپنے بچپن سے اپنے تخیل میں محسوس کرتا آیا ہوں، چھری آپ کے ہاتھ میں ہے، مگر میرے لیے وہ دھات نہیں، سکون ہے، میری گردن پر آپ کی انگلیوں کا لمس ہے، گرم، یقین دینے والا کہ آج واقعی میں اپنی مقدس ہستی کے ہاتھوں ذبح ہونے والا ہوں، آپ میری کمر سہلاتے ہوئے کچھ پڑھتی ہیں میں معنی نہیں سمجھتا، صرف آپ کی آواز سنتا ہوں، جیسے کسی لمبے سفر کے بعد گھر کا دروازہ کھل رہا ہو اور آگے صرف سکون ہی سکون ہو، میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں، دنیا غائب ہو جاتی ہے اب بس آپ ہیں اور میرا اطمینان۔ پھر وہ لمحہ آتا ہے جو رکتا نہیں، چھتری کی تیز دھار میری گردن پر چل رہی ہے تکلیف محسوس ہوئی لیکن آپ کے ہاتھوں ذبح ہونے کا احساس ہر چیز پر غا' ب آ چکا تھا، سانس کے درمیان ایک لمبی خاموشی اور بس اب میں جا رہا ہوں اپنے ابدی سفر کی طرف۔

اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اسکرین پر کوئی اور میسج نہیں آیا۔ میں اس کے جواب کے انتظار میں دیر تک آن لائن رہی پھر اس کو میسج لکھا مگر سینڈ کرنے سے پہلے اس کا اکاؤنٹ غائب ہو گیا۔۔ رابطہ منقطع تھا کیونکہ بکرا ذبح ہو چکا تھا مگر اب مجھے اپنی مقدس ہستی ڈھونڈنی تھی کیونکہ کہیں نہ کہیں ہم سب بکرے ہیں۔

شمیم آزر

امریکا

غزل

اے خدا وحشتِ امروز کو کچھ کم کر دے\
یا مری آتشِ احساس کو مدھم کر دے

یہ مرے لوگ مری بات تو کیا سمجھیں گے\
میرے اظہار کو کچھ اور بھی مبہم کر دے

یہ سکوں اس پہ قیامت کا گماں ہوتا ہے\
کوئی طوفان تری فکر کو برہم کر دے

وقت، اے سب سے بڑے چارہ گر و چارہ ساز\
میرے زخموں کو مرے وراسطے مرہم کر دے

میں وہی ہوں کہ جسے تو نے خدائی دی تھی\
پھر مجھے واقفِ اسرارِ دو عالم کر دے

اب کے بے حس ہوئے لوگ ایسے کہ خوش ہیں نہ ملول\
دیدۂ خشک کو پھر دیدۂ پرنم کر دے

میں یہ سمجھوں کہ یہ پتھر نہ کبھی پگھلیں گے\
تیری یاد آئے تو پھر آنکھوں کو پرنم کر دے

یوں دمک اُٹھی ہیں بجھتی ہوئی آنکھیں آزر\
ذہن کی سطح کو جیسے کوئی برہم کر دے

حسن عباسی / لاہور

جب بھی خود کو سپردِ شام کیا\
ایک تارے نے آ سلام کیا\
بھول آیا میں اپنا آپ وہاں\
چار دن جس جگہ قیام کیا\
خواب میں آ کہ آنسوؤں میں اُتر\
میں نے آنکھوں کو تیرے نام کیا\
رات میں نے ترے تصور میں\
دیر تک چاند سے کلام کیا\
عمر گزری محبتیں کرتے\
ہم سے جو ہو سکا وہ کام کیا\
میر صاحب ملے تو پوچھیں گے\
صبح کو کس طرح سے شام کیا\
ہم وہ تقریب کر نہ پائے حسن\
عمر بھر جس کا اہتمام کیا

✦✦✦

لبنیٰ صفدر / لاہور

ویسے تو بندہ بندہ دشمن ہے\
شک محبت کا پہلا دُشمن ہے\
اس لیے پاؤں اُلٹے پڑتے ہیں\
میری منزل کا رستہ دشمن ہے\
گھر سے باہر قدم ہے پہلا مرا\
دھوپ دشمن ہے سایہ دشمن ہے\
آئینے کی طرح ہوں میں شفاف\
میرا انداز میرا دشمن ہے\
جھونکے کا ہے دیے سے کیا رشتہ\
آدھا ہے دوست آدھا دشمن ہے\
پیسہ ہی دوست ہے غریبی میں\
اور امیری میں پیسہ دشمن ہے\
لبنیٰ کیسی معافی اس کے لیے\
جو بھی دشمن ہے پورا دشمن ہے

✦✦✦

افسانہ

پانچ دروازے

منیر احمد فردوس

آنکھ کھولتے ہی حیرت نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا سانس لے رہی تھی حیرتوں سے چھلکتی ہوئی، سرسراہٹوں سے لپٹی ہوئی اور اسرار سے بھری ہوئی انوکھی دنیا۔ ہر جانب سبزہ اوڑھے اونچے اونچے پہاڑ، چوٹیوں کی اوٹ سے نرم حرارت پھینکتا سنہری سورج، گھنے جنگلوں میں گیت گاتے پنکھ پکھیرو، شاخوں کا ہرا لباس پہنے سرسبز پیڑ، پہاڑوں کے دامن میں سفید جھاگ اگلتے پانی کے جھرنے، نیلگوں آسمان پر اڑان بھرتے پنچھی اور ہر طرف بولتے دلکش نظارے اس کی پلکوں پر حیرت کی نرالی کہانیاں لکھ رہے تھے، جیسے قدرت نے اس کے جنم دن پر پوری دھرتی اسے دان کر دی ہو۔

وہ سرشاری اور تجسس میں ڈوبا کائنات کے کونے کونے کو جیتا رہا اور وقت کی انگلی تھامے ایک سے دوسرے منظر میں اترتا رہا۔ ان ہی پر کیف نظاروں میں دن رات گھومتے گھماتے ایک دن وہ ایسی انجان جگہ جا پہنچا جہاں ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ وہ ٹھٹکا اور اس دروازے کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر تجسس نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور وہ بے اختیار دروازہ کھول کر اس کے اندر داخل ہو گیا۔

اندر قدم رکھتے ہی وہ ایک بڑے سے غار کے ویرانوں میں کھڑا تھا اور ایک نئی دنیا اس کے سامنے تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا، باہر بارش کے قطرے پتھروں اور پتوں سے ٹکرا کر جلترنگ بجانے لگے۔ اس نے دیکھا، غار میں ہر طرف چھوٹے بڑے نوکیلے پتھر بکھرے تھے۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک کھردرا پتھر دبا ہوا تھا اور سامنے ایک زخمی ہرن تڑپ رہا تھا۔ اس کی حیران آنکھوں سے کئی سوال رس رہے تھے اور پیٹ پر بھوک بندھی تھی، مگر بھوک ان سوالوں پر حاوی ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور تڑپتے ہرن پر وار کر دیا۔ چیخ غار کی دیواروں کو چیرتی ہوئی دور تک پھیلتی چلی گئی۔ گاڑھا سرخ سیال ہرن کے نرم و نازک جسم سے بہنے لگا۔ ایک بوند اس کے ہونٹوں سے ٹکرائی تو نئی طرح کی لذت اس کے تن من میں دوڑ گئی۔ اسے یہ نیا ذائقہ مزہ دے گیا اور وہ ہرن کا گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگا، جیسے صدیوں کی بھوک اس ایک وجود میں چھپا دی گئی ہو۔

وہ خون آلود ہونٹوں کے ساتھ اٹھا اور غار کی دیواروں کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ جہاں عجیب طرح کے نقش و نگار ابھرے ہوئے تھے، کہانیاں جنہیں وہ سمجھنے سے نا آشنا تھا، مگر غار کی طلسمی خاموشی اسے اپنی طرف بلاتی رہی اور وہ خاموشی کو سونگھتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ غار کے اندر کی انوکھی دنیا ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ برسوں غار میں سفر کرتا رہا اور اس کے اندر کی اسرار بھری زندگی جیتا رہا۔ جس کا اختتام ایک اور دروازے پر ہوا، جو پہلے سے بھی زیادہ بڑا اور پراسرار تھا۔ وہ غار کے ویرانوں میں ایک اور دروازے دیکھ کے گم صم کھڑا تھا۔ اس کے تجسس نے ایک چٹکی بھری اور اس نے بے چین ہو کر اس کے بڑے بڑے کواڑ کھول کے اس کے اندر قدم رکھ دیے۔

منظر بدل چکا تھا۔ کھلا آسمان، ایک بڑی سی سرسبز وادی، بیچ میں ابلتا ہوا پانی کا چشمہ اور اس کے کنارے پر کھڑے دو قبیلے جو اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ایک قبیلے کا سردار بنا زرہ پہنے پہلی صف کے آگے موجود تھا۔ عورتوں کے چہروں سے اداسی ٹپک رہی تھی، بچے پیاس سے تڑپ رہے تھے اور مرد ہاتھوں میں تلواریں، نیزے، بھالے اور جنگی ہتھیار تھامے نعرے لگا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں اب پتھر کی بجائے تانبے کی تلوار چمک رہی تھی۔

"یہ پانی ہمارا ہے، خبردار اس کی طرف بڑھے تو۔" قبیلے نے اسے للکارا

"نہیں... یہ ہمارا ہے، اس کی ایک بھی بوند تمہیں نہیں ملے گی۔" اس نے تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے کہا اور دشمن پر وار کر دیا۔

اگلے ہی لمحے قبیلوں کے بیچ گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ نیزے اور تلواریں آپس میں ٹکرائیں، تیر ہوا کو چیرتے ہوئے جسموں میں کھب گئے۔ بچے، عورتیں، مرد، بوڑھے بہت سے لوگ مارے گئے اور چشمے کا پانی سرخ ہو گیا۔ جنگ پلٹا کھا گئی اور دوسرے قبیلے کے جنگجوؤں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں سے نکل بھاگا مگر لشکر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار سرخ ہوتے چشمے کے ساتھ ساتھ سرپٹ دوڑنے لگا، لشکر کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ چشمے کا پانی لہر در لہر بہہ رہا تھا اور وہ آگے ہی آگے بھاگا جا رہا تھا۔ لشکر برسوں اس کے پیچھے پڑا رہا، وہ جگہ جگہ چھپتا پھرا مگر یہ تعاقب کبھی ختم نہ ہوا۔ ایک دن اس کا گھوڑا تھک ہار کر نڈھال حالت میں ایک قدِ آدم دروازے کے سامنے جا کے رک گیا۔ اتنا بڑا دروازہ دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ دور کہیں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں اور ان کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ گھبرا گیا کہ لشکر کسی بھی وقت اسے گھیرے میں لے سکتا ہے۔ آس پاس چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور گھوڑے سمیت اس کے اندر پناہ لے لی۔

سامنے ایک بڑا سا شہر آباد تھا۔ اونچے مینار، پتھروں کی شاندار عمارتیں اور محل کی بالکونی سے نیچے تک پھیلا ہوا بڑا سا قلعہ۔ وہ سنہری لباس پہنے تخت پر بیٹھا تھا اور دربان اس کے آگے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ رعایا کے لوگ پتھروں کے بھاری بھرکم بلاک اٹھا اٹھا کر قلعے کی دیواریں کھڑی کر رہے تھے۔ دھوپ میں جھلتے نڈھال لوگ بار بار گر پڑتے، لیکن اس کے حکم پر ان کے نحیف جسموں پر کوڑے برسائے جاتے اور انہیں زبردستی کھڑا کر دیا جاتا۔ کچھ لوگ

بھوک سے مر گئے، کچھ پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور کئی کوڑے سہتے ہوئے گرے تو پھر نہ اٹھے۔ مگر قلعے کے بلند ہوتے ستون نڈر کے اور وہ مزید اونچے ہوتے گئے۔ جب سینکڑوں لوگوں کی جانیں چلی گئیں تو ایک دن رعایا بغاوت پر اتر آئی اور اس کے خلاف نعرے لگنے لگے۔ لوگ لاٹھیاں، پتھر اور مشعلیں اٹھائے اس کی طرف بڑھے تو محل کے درو دیوار ہلنے لگے۔ وہ تیزی سے پھیلتی بغاوت سے خوف کھا گیا اور تخت چھوڑ کر محل سے نکل بھاگا۔ ریاست کی گلیوں میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ہر طرف دھواں، شور، ہنگامہ اور چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ آگے تھا اور رعایا اس کے پیچھے پڑی تھی۔ وہ جنگلوں جنگلوں چھپتا پھرا مگر اس کے خلاف بغاوت کی بھڑکتی ٹھنڈی نہ ہو سکی اور اسے کہیں بھی پناہ نہ ملی۔ وہ جہاں بھی گیا اس کے خلاف نفرت اور غصے کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔ اس کسمپرسی اور بے سروسامانی کی حالت میں بھڑکتے شعلوں کے اُس پار اسے اچانک ایک انوکھا دروازہ دکھائی دیا جس کی لمبائی کا کوئی اختتام نہیں تھا۔ وہ ویرانوں میں ایسا عجیب و غریب دروازہ دیکھ کے ٹھٹا گیا مگر بپھری رعایا سے بچنے کے لیے یہ ایک بہترین جگہ تھی۔ وہ دروازے کے بڑے بڑے پٹ دھکیل کے گھوڑے سمیت اس میں چھپ گیا۔

چاروں طرف فضا دھندلائی ہوئی تھی۔ پھیلتے دھوئیں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کارخانوں کی اونچی چمنیاں مسلسل بھاپ اگل رہی تھیں۔ ہر طرف مشینوں کا شور تھا جو کانوں کو پھاڑے دے رہا تھا۔ اور وہ بڑی سی فیکٹری کا مالک بنا شاندار تھری پیس سوٹ پہنے دفتر میں آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ فیکٹری میں لاغر جسموں والے بہت سے مزدور دھوئیں میں کھانستے ہوئے مشینوں پر کام کر رہے تھے۔ اچانک ایک کمزور سے دبلے پتلے مزدور کے بازو مشین کے بے رحم دہانے میں کچلے گئے۔ خون کے دھبے تیار ہوتے سفید کپڑے پر بکھر گئے اور دھاگوں کی لڑیاں سرخ ہو گئیں۔ مالک کے چہرے پر غصے کے نوکیلے کانٹے اگ آئے۔ اس نے طیش میں آ کر مزدور کو گالیاں دیں اور اسے کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیا۔

اس زیادتی کے خلاف سارے مزدور اکٹھے ہو گئے اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ہڑتال کی صدا فیکٹری کی دیواروں سے ٹکرائی تو مشینیں بند ہو گئیں۔ ہاتھوں میں ہتھوڑے اور اوزار لہراتے مزدور اس کے دفتر کا گھیراؤ کرنے لگے۔ مالک سہم گیا اور اس نے خطرے کی بو سونگھ لی۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے سامنے کی دیوار میں بنے ہینڈل کو گھمایا تو دیوار شق ہو گئی اور وہاں ایک آہنی دروازہ نمودار ہو گیا، یہ خفیہ دروازہ اس نے ایسے ہی مشکل وقتوں میں فرار ہونے کے لیے بنوا رکھا تھا۔ مزدوروں کے پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دروازہ کھولا اور وہاں سے نکل بھاگا۔

چہار سو بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی اور فضا دھماکوں سے لرز رہی تھی۔ آسمان پر دھوئیں کے سیاہ بادل چھائے تھے، جن کے بیچ سے جنگی جہازوں کی قطاریں نکل رہی تھیں۔ زمین پر جگہ جگہ آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، عمارتیں لمحوں میں ڈھیر ہوئی جا رہی تھیں، سڑکوں پر بھاگتے چھپتے بے گناہ انسانوں کی چیخیں گولیوں کی تڑتڑ اور توپوں کی گھن گرج میں دفن ہو رہی تھیں۔ دنیا کی کئی ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں۔ کہیں میزائل داغے جا رہے تھے، کہیں ٹینک زمین کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دریا خون سے بھر گئے، درخت شعلوں میں گھر گئے اور پہاڑ دھماکوں سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے۔

وہ ایک بٹالین کی کمانڈ سنبھالے کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر وردی تھی، سینے پر تمغے اور ہاتھ میں ایک بکس دبا تھا جس میں ایک سرخ بٹن چمک رہا تھا۔ جنگی جہاز آسمان پر چنگھاڑتے گزر رہے تھے، توپیں دھاڑ رہی تھیں۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی، انسانیت تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی تھی۔ سب کی نظریں اس کے ہاتھ پر جمی تھیں جس میں سرخ بٹن تھا۔ اور بالآخر اس نے لرزتی انگلیوں سے بٹن دبا دیا۔

اچانک ایک تیز روشنی چمکی اور شعلوں کی بڑی سی چھتری آسمان تک پھیل گئی۔ یکے بعد دیگرے چکاچوند روشنی کی کئی چھتریاں ایک ساتھ آسمان کی طرف لپکیں، جنہوں نے پوری دھرتی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لمحوں میں عمارتیں بھسم ہو گئیں، انسان جل کر خاکستر ہو گئے اور شہر راکھ بن کر اڑ گئے، یہاں تک کہ سمندر زہریلی بھاپ میں تبدیل ہو گئے۔ تابکاری فضا نے دریاؤں، جنگلوں، پہاڑوں، ملکوں اور آبادیوں کو چاٹ لیا۔ کروڑوں نہیں، اربوں انسان ایک ہی لمحے میں مٹ گئے۔ ایٹمی جنگ نے زمین کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا تھا اور ہر طرف سناٹا اگ آیا۔ ایسا سناٹا جس میں نہ پرندے تھے، نہ بچے، نہ کوئی گیت، نہ دعا۔ ہر طرف پگھلے اور جھلسے ہوئے انسانی وجود پڑے تھے۔

پوری دھرتی راکھ ہو گئی تھی اور کہیں زندگی نہیں بچی تھی مگر سب ختم نہیں ہوا تھا۔ کچھ لوگ زندگی کو بچانے کے لیے، ایٹمی جنگ سے قبل ہی ایئر شپ میں سوار ہو کر زمین کے مدار کو چھوڑ چکے تھے، جیسے وہ کسی چھٹے دروازے کی تلاش میں نکلے ہوں۔ ایئر شپ ان کے لیے چھٹا دروازہ ہی ثابت ہوئی تھی۔ جب وہ شپ کا دروازہ کھول کر خلائی لباس پہنے اجنبی سیارے کی سطح پر اترے تو ہر طرف بے رنگ چٹانیں، سوکھے پہاڑ اور دور دور تک پھیلی خاموشی تھی۔ نہ سبزہ، نہ پانی، نہ ہوا، نہ کوئی ذی روح۔ بس چاروں طرف پتھر ہی پتھر تھے۔

"یہ منظر تو ہم نے صدیوں پہلے بھی دیکھا تھا۔"

ان میں سے کوئی گویا ہوا اور انہیں بے اختیار پہلا دروازہ یاد آ گیا۔ تب کسی نے زمین سے لائی ایک جلی ہوئی ڈائری کھولی، جس کے آخری صفحے پر لکھا تھا:

"ہم نے آنکھ کھولی تو ہمارے ہاتھ میں پتھر تھا اور آنکھ بند کی تو انگلی سرخ بٹن پر تھی۔"

وہ سب ایک دوسرے کو افسردہ نظروں سے دیکھنے لگے کہ ایک بار پھر وہ پتھر کے زمانے میں پہنچ گئے تھے۔

ہمبرسٹون

عامر بن علی/ جاپان

سلطنت برطانیہ کے زیر تسلط رقبہ جب اس قدر وسیع وعریض تھا کہ اس میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، نوآبادیاتی عہد کے عروج کے اس دور میں بھی انگریز کبھی براعظم جنوبی امریکہ میں داخل نہیں ہوا تھا۔ شاید سپین اور پرتگال کے ساتھ اس کا یہ خاموش معاہدہ تھا کہ ''ادھر ہم، ادھر تم'' اسی وجہ سے وہ شمالی امریکہ کی طرف اپنی سلطنت کو توسیع دیتا رہا۔ جنوبی امریکہ کے بحرالکاہل کے ساتھ ساحل پر نظر دوڑائیں تو نقشے میں چلی کی حدود میں واقع پیرو اور بولیویا کی سرحد کے قریب، ایک شہر کا انگریزی نام پڑھ کر آدمی ٹھٹک جاتا ہے، ''ہمبرسٹون'' خالص انگریزی نام ہے۔ ورنہ پورے براعظم میں شہروں کے ہسپانوی یا پرتگیزی نام ہی سنتے ہیں، یا پھر مقامی قبائلی قدیم ناموں کے ساتھ ساتھ کہیں ولندیزی اور بہت ہوا تو کوئی اطالوی نام نظر آجاتا ہے۔ مگر انگریز اور اس کی زبان انگریزی کا ادھر سے گزر نہیں ہوا۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی جانب سے اس شہر کو عالمی ورثہ قرار دیا گیا ہے۔ شاید یہ نام کی کشش تھی جو مجھے اس شہر میں لے گئی۔ کہنے کو تو اس شہر کو بھوت نگر یا اجڑا دیار بھی کہا جاسکتا ہے مگر آثار قدیمہ کہتے ہوئے جھجک رہا ہوں کیونکہ یہ جدید طرز کا شہر ہے اور اب پورے شہر کو عظیم الشان میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یوں کہنا زیادہ موزوں ہے کہ ہمبرسٹون اب کوئی آباد بستی نہیں بلکہ آثار قدیمہ کا بہت بڑا میوزیم ہے۔ اس دیار کا فقط نام ہی انگریزی نہیں، تمام طرز تعمیر بھی برطانوی ہے، اگر کسی نے جنوبی امریکہ میں انگریزی طرز کی جھلک دیکھنا ہو تو اس کے لیے ہمبرسٹون سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس شہر کے بسنے اور اجڑنے کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ یہ کہانی زمین کی زرخیزی کے لیے استعمال ہونے والی کھاد سوڈیم نائیٹریٹ کے ارتقاء سے جڑی ہوئی ہے۔ ہمبرسٹون بنیادی طور پر اس کھاد فیکٹری کا نام تھا۔ جو یہاں سوڈیم نائٹریٹ بناتی تھی۔ جسے سائنسی زبان اور عرف عام میں اب بھی چلی کی نسبت سے چلی سالٹ پیٹر کہا جاتا ہے۔ اس مقام کا اگر یوں تعارف کروایا جائے تو سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ ٹھیک ایک صدی پہلے پوری دنیا میں استعمال ہونے والی زمین کی زرخیزی برقرار رکھنے کا باعث نائیٹریٹ کھاد کا 65% حصہ اس فیکٹری میں تیار کیا جاتا تھا، یہ کوئی مبالغہ نہیں، اعداد وشمار کے علاوہ آثار بتاتے ہیں کہ واقعی 65 فیصد اس فیکٹری میں تیار ہوتا ہوگا۔ فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے لاطینی امریکہ کے مقامی باشندے طویل عرصے سے سوڈیم نائیٹریٹ کا استعمال کرتے آرہے تھے، یورپ میں اس کی ڈیمانڈ تب بڑھی جب بم بنانے کے لیے، دھماکہ خیز مواد کے طور پر سالٹ پیٹر کا استعمال اور طلب بڑھ گئی۔ صدیوں سے ریڈ انڈین جسے زمین کی زرخیزی کا ٹوٹکہ کہہ کر استعمال کرتے آرہے تھے، اسے 1830 عیسوی میں سائنسدانوں نے تجربات کے بعد تسلیم کیا اور مہر تصدیق ثبت کر دی کہ یہ سوڈیم نائیٹریٹ زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لیے واقعی کارگر ہے، اس سے نائیٹریٹ کی صنعت نے مزید رفتار پکڑلی۔

اس کھاد فیکٹری کا رہائشی علاقہ قابل دید ہے، ساڑھے تین ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک جدید شہر کا نمونہ تھا۔ ٹینس، باسکٹ بال، بیڈمنٹن کے علاوہ وہ فٹ بال کا وسیع وعریض میدان، اتنے سارے کھیلوں کا اہتمام کہ گنوانا مشکل ہے، اسپتال، سینما، تھیٹر، اوپیرا ہال، مختصر یہ کہ ایک جدید شہر میں جو سہولیات آپ سوچ سکتے ہیں وہ تمام یہاں پر مہیا کی گئی تھیں۔ جنگل میں منگل کی عملی تصویر نظر آتا ہے یہ علاقہ۔ انگریزی طرز تعمیر کے اس رہائشی علاقے میں داخل ہوں تو لگتا ہے جیسے پاک وہند کے کسی قدیم روایتی ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو رہے ہیں، برصغیر کا ریلوے نظام بھی چونکہ انگریز کا تعمیر کردہ ہے اس لیے مماثلت قابل فہم ہے۔ یہاں ہمبرسٹون نامی برطانوی شہری اور سائنسدان کا بھی تذکرہ کرتا چلوں۔ جس نے یہ فیکٹری قائم کی پھر اس کی دیکھا دیکھی چند اور فیکٹریاں بھی بن گئیں۔ مگر پھر بھی اس مقام کو نائیٹریٹ کی پیداوار کے لیے سائنسی بنیادوں پر چننے کا سہرہ اسی کے سر پر بندھتا ہے، جس نے صحراؤں کی خاک چھان کر یہ جگہ تلاش کی تھی اور کھاد فیکٹری اس بیابان میں قائم کی۔

اس کھاد پلانٹ کے قریب ترین بندرگاہ ستر کلو میٹر کی دوری پر اقیقی شہر کی تھی۔ اقیقی کی بندرگاہ اس وقت تک بس مچھلیاں وغیرہ پکڑنے والی کشتیوں تک محدود تھی مگر ہمبرسٹون سے پیدا ہونے والی کھاد کی برآمد کے سبب یہ پورٹ دن دگنی اور رات چگنی ترقی کرنے لگی۔ اس بندرگاہ کا تمام تر انحصار اسی سالٹ پیٹر کی برآمد پر تھا۔ یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ اس وقت یہ کھاد کا پلانٹ اور شہر اقیقی پیرو کا حصہ تھے، چلی اور پیرو کے درمیان ہونے والی جنگ جس کے نتیجے میں یہ شہر اور سینکڑوں میل کا علاقہ چلی کے قبضے میں چلا گیا، اس

جنگ کے اسباب میں ایک بنیادی محرک یہ اور اس سے ملحقہ کھاد پلانٹ تھے جو ہمبر سٹون میں واقع تھے۔

بحرالکاہل کی جنگ سے تاریخ میں یاد کی جانے والی اس لڑائی میں برطانیہ نے چلی کی حمایت کی تھی اور چلی نے برطانیہ کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ اس کی جنگ میں مدد کرے تو اس فیکٹری کو قومیایا نہیں جائے گا، یہ وعدہ وفا بھی ہوا مگر جنگ کے نتیجے میں بولیویا سمندر سے محروم ہو گیا اور پیرو اپنے سینکڑوں مربع میل رقبے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

عروج کے زمانے میں تشہیر کے لیے بنائے گئے اشتہار دیکھ کر خوشگوار حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب دہلی کے ڈسٹی بیوٹر کی جانب سے جاری کردہ اشتہار میں ایک پنجابی کسان نائیٹریٹ کے استعمال کے سبب کپاس اور مکئی کی بھرپور فصل اٹھا کر مالا مال اور دوسری تصویر میں کسان نائیٹریٹ استعمال نہ کر کے بدحال، پریشان و پشیمان دکھایا گیا ہے۔ چین و عرب سے لیکر ہندوستان اور برازیل تک ملکوں ملکوں چلی کی قدرتی کھاد سوڈیم نائیٹریٹ کے اشتہارات اور ہر زبان میں تعریف، توثیق عظمت رفتہ کی یاد دلاتی ہے۔

زوال کی داستان بھی کمال دلچسپ ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے ہنگام برطانیہ کی خواہش اور ایماء پر جرمنی کو سوڈیم نائیٹریٹ کی برآمد چلی نے بند کر دی، اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو چلی سالٹ پیٹر دھماکہ خیز خصوصیات کے باوصف بم سازی میں استعمال ہوتی تھی، اور دوسری وجہ زمین کی زرخیزی اور فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے یہ کھاد معاون تھی۔ ہر دو صورتوں میں یہ صورتحال انگلستان کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا بحرالکاہل کی جنگ میں پیرو اور بولیویا کے خلاف برطانیہ عظمیٰ نے چلی کا ساتھ دیا تھا جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ پلانٹ، شہر بلکہ ہزاروں مربع میل کا علاقہ فتح کرنے میں وہ کامیاب ہو سکا۔ اسی لیے وہ برطانیہ کا پہلی جنگ عظیم میں ساتھی اور حلیف تھا۔ عالمی سچائی پر مبنی ایک مقولہ ہے جو دنیا کی ہر زبان میں الفاظ کے تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ موجود ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔

جرمنی کو نائیٹریٹ کی فراہمی پر مکمل پابندی اور بندش کا نتیجہ نئی ایجاد کی صورت میں سامنے آیا، وہ تھی جرمنی کی جانب سے لیبارٹری میں تیار کردہ مصنوعی سوڈیم نائیٹریٹ۔ اس مصنوعی سالٹ پیٹر کی ایجاد نے چلی کے شمالی علاقے میں واقع کھاد کی پیداوار کی اس صنعت کی بربادی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اندازہ لگائیں کہ سن 1910 میں دنیا بھر میں استعمال کی جانے والی سوڈیم نائیٹریٹ کا دو تہائی حصہ اس شہر میں پیدا ہوتا تھا، اگلے بیس برس میں وہ کم ہو کر فقط دس فیصد تک رہ گیا۔ جب سن 1950 آیا تو پیداوار کا یہ تناسب عالمی پیداوار کا فقط تین فیصد حصہ رہ گیا تھا۔ جیمز تھامس ہمبر سٹون کا بسایا ہوا یہ شہر 1960ء تک مکمل طور پر اجڑ چکا تھا۔ سلوادور آیندے کی سوشلسٹ حکومت نے اسے 1970 میں قومی ورثہ قرار دے دیا۔ 2005ء میں اس نگر کو عوام الناس اور سیاحوں کے لیے دوبارہ کھولا گیا، اب یہ میوزیم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسی سال اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی جانب سے اسے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دے دیا گیا۔ کھاد فیکٹری کی مینار نما سو میٹر اونچی چمنی سے اب دھواں نہیں اٹھتا۔ مگر سڑک پر سفر کرنے والے مسافروں کو یہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ گزرے ہوئے عہد کا اعلان اور تعارف دور سے ہی یہ آہنی چمنی کروا دیتی ہے۔

عامر بن علی

جاپان

غزلیں

مرا درد میرا سوال ہے
ترا بھولنا بھی کمال ہے

ترے بعد ایسی ہے زندگی
نہ خوشی نہ کوئی ملال ہے

ہیں اٹل اصول زمین کے
کہ عروج کو ہی زوال ہے

ہے فقیہہ شہر کا فلسفہ
ملے مفت میں جو، حلال ہے

نہیں ختم ہوں گی صعوبتیں
مرے چارہ گر کا خیال ہے

....

جن کی تھی آرزو وہی پیارے نہیں ملے
مدت ہوئی ہے دوست ہمارے نہیں ملے

منجدھار سے گلہ ہے نہ کچھ ناخدا کا دوش
قسمت کی بات ہے کہ کنارے نہیں ملے

امبر سے توڑ لانے کی خواہش تھی کب ہمیں
ہم کو تمہاری مانگ کے تارے نہیں ملے

ملنے کی آرزو تو بہت تھی مگر اے دوست
قسمت کہ تجھ سے اپنے ستارے نہیں ملے

پنچھی نے جستجو تو بہت کی مگر کبھی
بچھڑے جو آندھیوں میں بچارے نہیں ملے

محرومیوں کے ساتھ ملیں ذلتیں تمام
کمزور کو جہاں میں سہارے نہیں ملے

ٹاور آف لندن

فقیر اللہ خاں/امریکا

ٹاور آف لندن وسطی لندن میں دریائے ٹیمز کے شمالی کنارے پر ایک خوبصورت چار منزلہ تاریخی عمارت ہے۔ اسے لندن کے فاتح ولیم (1087ء-1066ء) نے 1078ء میں تعمیر کروایا تھا۔ برطانیہ کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ عمارت بعد میں آنے والے بادشاہوں کی تاج پوشی، عقوبت خانہ، مقتل گاہ، قید خانہ اور اسلحہ خانہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ یہ سب کچھ اس ٹاور آف لندن جیسی عظیم عمارت کی چھتوں کے سایہ تلے ہوتا رہا۔ باغیوں کو قید کر کے اُن کے سر کچلے جاتے تھے۔ ملکاؤں، بادشاہوں اور شہزادوں کو اسی عمارت میں تختہ دار پر چڑھایا جاتا تھا۔ اس وجہ سے یہ عمارت ایک آسیبی قلعہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ شاہ ہنری ہفتم اور اُس کی دو بیویوں کو اسی قلعہ میں پھانسی دی گئی۔ ایک بیوی کا نام کیتھرین اور دوسری کا نام لیڈی جین گرے تھا، پھانسی کے وقت اس کی عمر صرف 16 سال تھی۔ گیارہویں صدی سے لے کر بعد تک قیدیوں، باغیوں اور پھانسی پانے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس لیے اس عمارت کو خونی ٹاور بھی کہا جاتا ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران 12 جاسوسوں کو اسی عمارت میں پھانسی دی گئی۔

اس عمارت کی حفاظت پر مامور سیکورٹی کے عملہ نے کئی بار یہاں روحوں کو روتے، چنگھاڑتے اور بھاگتے بھی دیکھا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ آج جب کہ ترقی یافتہ انسان، جس نے چاند کو تسخیر کرنے کے بعد کائنات کے دوسرے سیاروں پر بھی کمندیں ڈال دی ہیں، بھوت پریت جیسی مافوق الفطرت چیزوں پر اندھا یقین رکھتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں 13 کے ہندسے کو منحوس تصور کیا جاتا ہے۔ کسی بھی فلک بوس عمارت پر ہم اور آپ تیرہویں منزل نہیں دیکھ پائیں گے۔ غرضیکہ یہ عظیم الشان اور پرشکوہ عمارت کئی لرزہ خیز داستانوں اور بربریت سے بھرپور مناظر کی شاہد ہے۔ اسی ضمن میں کووں (Raven) کا ذکر آگے آئے گا۔

ٹاور آف لندن موجودہ بادشاہ چارلس سوم کی سرکاری رہائش گاہ بھی ہے، ٹاور آف لندن کو رائل پیلس بھی کہا جاتا ہے۔ 1988ء میں اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو نے ٹاور آف لندن کو عالمی ورثہ کی فہرست میں شامل کیا۔ ٹاور آف لندن کا کل رقبہ 12 ایکڑ اور اس چار منزلہ عمارت کی اونچائی 89 فٹ ہے۔ اس قلعہ نما محل کی چاروں اطراف دیواریں کنکریٹ سے تعمیر کی گئی ہیں۔ دریائے ٹیمز پر مشہور پل لندن برج بھی اسی ٹاور کی مناسبت سے قریب ہی واقع ہے۔

یہ ٹاور آف لندن کئی عمارتوں کا کمپلیکس ہے۔ اس میں دو میوزیم بھی موجود ہیں، جن میں ماضی کے بادشاہوں کے تاج، ہیرے جواہرات اور ملکاؤں کے گلے کے ہار رکھے ہوئے ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ عمارت ٹکسال کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ ایک چڑیا گھر بھی تھا جس میں بادشاہوں نے شیر اور مگرمچھ بھی رکھے ہوئے تھے۔ شاہوں کے شوق نرالے، والی بات اس عمارت کے مکینوں پر صادق آتی تھی۔ اس خوبصورت عمارت کو دیکھنے کے لیے ہر سال 30 لاکھ سے زائد لوگ آتے ہیں۔

سیانے کوے

صدیوں سے یہ قلعہ نما محل کووں کا بھی گھر ہے۔ بادشاہ چارلس دوم (1685ء-1630ء) نے ایک دفعہ حکم دیا کہ ان کووں کو اس محل سے نکال دیا جائے۔ اس کو نجومیوں نے بتایا کہ اگر ان کووں کو یہاں سے نکال دیا جائے تو قلعہ میں نقصان ہوگا، تاج برطانیہ کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور اس کے علاوہ مملکت مہلک وبا کی لپیٹ میں بھی آ سکتی ہے۔ بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا اور ساتھ یہ حکم دیا کہ صرف چھ کوے اس محل میں موجود رہیں اور باقی کو تلف کر دیا جائے۔ اس وقت سے چھ کوے محل میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں ان کے نام یہ ہیں:

(۱) جوبلی (۲) ہیرس (۳) گرپ
(۴) راکی (۵) پوپی اور (۶) ایرینہ

ان کووں کو بسکٹ، گوشت اور انڈے روزانہ خوراک میں دیے جاتے ہیں۔ ان کووں کے پر بھی اتنے کاٹ دیے جاتے ہیں کہ کہیں یہ راہِ فرار اختیار نہ کر لیں۔ بھلا وہ کوے پاگل ہیں کہ جن کو اتنی اعلیٰ خوراک اور رہائش سرکاری طور پر میسر ہو وہ کہیں بھاگ جائیں، ایسا ناممکن ہے۔

تاریخ

ٹاور آف لندن میں ہر شام 9:53 پر ایک فوجی تقریب میں محل کی چابیاں دوسری گارڈ کو سونپی جاتی ہیں اور یہ تقریب صدیوں سے منعقد ہوتی چلی آ رہی ہے۔ یہ تقریب دُنیا میں سب سے پرانی فوجی تقریب سمجھی جاتی ہے۔ محل کا پہرہ دینے والے سپاہیوں کے لیے لازم ہے کہ انہوں نے کم از کم 22 سال تک ملک کی آرمی میں خدمات انجام دی ہوں۔ ہر وارڈن کی یونیفارم کی مالیت 7000 پاؤنڈ کے برابر ہے، کیونکہ یہ یونیفارم سونے کی تاروں سے تیار کی جاتی ہے۔

ٹاور آف لندن ایک قلعہ نما محل ہے، یہ قلعہ کیا ہے، برطانیہ کی جیتی جاگتی تاریخ ہے۔ اس کے در و دیوار پر ظلم کی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ دنیا کے لیے ایک مثالی ملک اور تہذیب و تمدن کے علم بردار شہر میں یہ سب کچھ ہوتا رہا لیکن اس میں چنداں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ دُنیا میں جہاں جہاں شہنشاہیت کی وراثت کا ذکر آئے گا، قتل و خون اور رنج و الم کی داستانیں رقم ہوں گی، ایسا ہوتا آیا ہے۔ تاج و تخت اُچھالے جائیں تو دریائے ٹیمز ہو، گنگا جمنا راوی ہو یا فرات ان کے پانیوں میں خون کی سرخی نظر آتی رہے گی، رہتی دنیا تک۔

تبصرۂ کتب

تبسمِ چمنستانِ ادب

مصنف: تفاخر محمود گوندل/ تبصرہ نگار: آغا تنویر

نامور ادیب پروفیسر تفاخر محمود گوندل کی نئی کتاب "تبسمِ چمنستانِ ادب" نہایت دیدہ زیب انداز اور معیاری طباعت کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب کی ایک نمایاں اور محترم شخصیت ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے فن، شخصیت، افکار، اوصاف اور علمی و ادبی محاسن پر ایک جامع اور خوبصورت تخلیقی کاوش ہے۔ پروفیسر تفاخر محمود گوندل نے نہایت باریک بینی اور علمی بصیرت سے ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے فکری جہان کو اجاگر کیا ہے۔ کتاب میں ان کے علمی خدمات، تدریسی کردار، فکری اثرات اور تخلیقی کارناموں پر مفصل اور دلنشین انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ محض ایک تذکرہ یا سوانح نہیں بلکہ ایک ادبی تجزیہ ہے جو قاری کو ہارون الرشید تبسم کی ہمہ گیر شخصیت کے قریب لے جاتا ہے۔ کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے سرورق کی زینت ملک کے نامور ادیبوں کی آراء ہیں جن میں عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر عبدالرؤف رفیقی (ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی پاکستان)، ڈاکٹر ریاض مجید، ارشد محمود ناشاد، اور ضیغم مغیرہ جیسے معتبر نام شامل ہیں۔ یہ بات اس کتاب کی وقعت اور اہمیت میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ نستعلیق پبلی کیشنز نے ہمیشہ معیار، خوبصورتی اور ادبی وقار کو مدِ نظر رکھا ہے، اور "تبسمِ چمنستانِ ادب" اس روایت کی ایک روشن مثال ہے۔ اعلیٰ معیار کا کاغذ، نفیس سرورق اور صاف ستھری طباعت اسے ایک دیدہ زیب اور وقار آمیز اشاعت بناتے ہیں۔ 268 صفحات پر مشتمل یہ کتاب محض 1000 روپے کی قیمت میں دستیاب ہے، جو قارئین کے لیے ایک نہایت قیمتی اور علمی تحفہ ہے۔ پروفیسر تفاخر محمود گوندل کی اس سے قبل شائع ہونے والی متعدد کتابیں بھی بیسٹ سیلر رہ چکی ہیں، اور موجودہ تصنیف ان کے علمی ذوق اور تحقیقی سنجیدگی کا ایک اور خوبصورت ثبوت ہے۔ "تبسمِ چمنستانِ ادب" اردو ادب کے قارئین، محققین اور اساتذہ کے لیے ایک وقیع اضافہ ہے، جو بلاشبہ ادبی تحقیق اور شخصی مطالعے کے شعبے میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوگی۔ نستعلیق مطبوعات اس شاندار اشاعت کے ذریعے ایک بار پھر ادبی خدمت کی روایت کو آگے بڑھا رہا ہے۔

چمنِ صَبُوحی

مصنف: اشرف صبوحی دہلوی (مرحوم)

تبصرہ نگار: آغا تنویر

بچوں کے نامور ادیب اشرف صبوحی دہلوی (مرحوم) کی کہانیوں پر مشتمل یادگار کلیات "چمنِ صبوحی" نہایت اہتمام اور خوبصورتی کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔ یہ 368 صفحات پر مشتمل مجموعہ اردو ادب کے اس سنہرے دور کی یاد تازہ کرتا ہے جب بچوں کے لیے کہانیاں محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ اخلاق، تربیت اور کردار سازی کا زینہ ہوا کرتی تھیں۔

اشرف صبوحی دہلوی کا شمار ان ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے بچوں کے ادب کو ادبی وقار، زبان کی شستگی اور فکری گہرائی سے مالا مال کیا۔ ان کی کہانیاں نہ صرف زبان و بیان کی نفاست کا نمونہ ہیں بلکہ ان میں سبق آموز واقعات، سادہ مگر دلکش پلاٹ، اور بچوں کے ذہنی و اخلاقی ارتقا کے لیے مفید پیغامات پوشیدہ ہیں۔ "چمنِ صبوحی" میں شامل کہانیاں بچوں کے لیے دلچسپ، معنوی اور سبق آموز ہیں جو نئی نسل کو نہ صرف مطالعے کی رغبت دیتی ہیں بلکہ زندگی کی قدروں سے بھی روشناس کراتی ہیں۔

کتاب کی طباعت اور تزئین و آرائش میں نستعلیق مطبوعات نے ہمیشہ کی طرح معیار کو مقدم رکھا ہے۔ واضح و خوبصورت فونٹ، مضبوط جلد، اور دیدہ زیب سرورق اسے ایک دلکش اشاعتی شاہکار بناتے ہیں۔ 1000 روپے قیمت کے باوجود اسے صرف 500 روپے رعایتی نرخ پر دستیاب کرنا قارئین اور بچوں کے لیے ایک بہترین موقع ہے کہ وہ اس ادبی خزانے کو اپنے کتب خانے کا حصہ بنائیں۔

''چمنِ صبوحی'' نہ صرف بچوں کے لیے ایک تحفہ ہے بلکہ والدین، اساتذہ اور ادب کے قدردانوں کے لیے بھی ایک لازمی مطالعہ ہے، جو یہ احساس دلاتا ہے کہ بچوں کا ادب محض تفریح نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کی فکری بنیادوں کی تشکیل ہے۔ اشرف صبوحی دہلوی کی یہ کلیات اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

نستعلیق مطبوعات نے ایک بار پھر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ نہ صرف معیاری کتابیں شائع کرتا ہے بلکہ اردو ادب کی عظیم شخصیات کی یاد کو بھی زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

زندگی

ناول نگار: ایس اعجاز علی/ تبصرہ نگار: آغا تنویر

اگر ناول ''زندگی'' کو سسپنس اور جاسوسی ادب کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ ایس اعجاز علی نے اردو جاسوسی ناول کی روایت میں ایک نیا فکری اور فنی موڑ پیدا کیا ہے۔ عام طور پر سسپنس اور جاسوسی ناول تیز رفتاری، سنسنی، اور تجسس پر مبنی پلاٹ کے ذریعے قاری کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں، مگر

زندگی "اس دائرے کو محض ایک تفریحی تجربے تک محدود نہیں رہنے دیتا۔ مصنف نے اس طرز کے اندر انسانی نفسیات، وجودی سوالات، اور جذباتی پیچیدگیوں کو اس طرح سمویا ہے کہ کہانی محض جرم و سراغ کی تلاش نہیں بلکہ خود زندگی کے اسرار کھولنے کا سفر بن جاتی ہے۔

ایس اعجاز علی نے جاسوسی فکشن کے کلاسیکی اجزا یعنی معمہ، تحقیق، جھوٹ اور سچ کی کشمکش، خطرہ، اور انجام کی غیر متوقع موڑ کو ایک گہرے انسانی پس منظر کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا ہے۔ کہانی میں واقعات کی ترتیب اور منظر نگاری میں فلمی تاثیر محسوس ہوتی ہے، جو قاری کو ایک لمحے کے لیے بھی اکتاہٹ میں مبتلا نہیں ہونے دیتی۔ کردار صرف مظلوم یا مجرم نہیں بلکہ اپنی داخلی دنیا کے قیدی بھی ہیں، جن کے فیصلے صرف حالات نہیں بلکہ ان کے ماضی، خوف، اور خواب متعین کرتے ہیں۔

ناول کا مرکزی پلاٹ اگرچہ سسپنس سے بھرپور ہے، مگر اس کے اندر چھپے موضوعات جیسے انسان کی شناخت، رشتوں کی ناپائیداری، اخلاقی کشمکش اور وقت کا دھوکہ، اسے محض تفریحی نہیں بلکہ فکری مطالعہ بھی بنا دیتے ہیں۔ مصنف نے جدید جاسوسی فکشن کی تکنیکوں جیسے متعدد نقطۂ نظر (Multiple POVs)، فلیش بیک، اور اندرونی مکالمے کو نہایت مہارت سے استعمال کیا ہے، جو اسے روایتی ڈائجسٹ طرز کے ناولوں سے الگ کرتا ہے۔

زبان و بیان میں روانی کے ساتھ فکری گہرائی، اور نثر میں جذباتی شدت، "زندگی " کو ایک نیا رنگ عطا کرتی ہے۔ اگر قاری سسپنس کے ساتھ ساتھ انسانی شعور کی تہوں میں جھانکنے کا شوق رکھتا ہے، تو یہ ناول اس کے لیے ایک غیر معمولی تجربہ بن جاتا ہے۔

نستعلیق مطبوعات نے اس ناول کی اشاعت میں جو معیار، طباعت اور جمالیاتی سلیقہ دکھایا ہے، وہ اس صنف کے سنجیدہ احیاء کی طرف اشارہ ہے۔ 500 صفحات پر مشتمل یہ ضخیم ناول اپنے حجم سے زیادہ اپنے اثر میں بھاری ہے ایک ایسا سسپنس ناول جو صرف ''کیا ہوا'' نہیں بلکہ ''کیوں ہوا'' کے سوال پر بھی قاری کو غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

مختصراً، "زندگی "اردو کے سسپنس اور جاسوسی ادب میں ایک بلند معیار کا اضافہ ہے ایسا ناول جو تفریح کے ساتھ فکر بھی دیتا ہے، اور جہاں ہر صفحہ قاری کو اپنی ہی زندگی کے کسی نہ کسی راز سے روبرو کر دیتا ہے۔

✦✦✦

ایاز احمد/لاہور

کیسے کہہ دوں وفا شعار نہیں
با وفا ہے پہ جاں نثار نہیں
کس لیے منہ بنائے بیٹھے ہو
میں خریدارِ حُسنِ یار نہیں
شوق سودا نہیں رہا لیکن
میری وحشت کا اعتبار نہیں
آتش دیدہ ہے مری زنجیر
ہے دھواں، دل میں پر غبار نہیں
در و دیوار سے ہے خطرہ کیا
جب مرا کوئی بھی دیار نہیں
ہم رہیں ایک در پہ ساکت کیوں
ہم تو ہیں پھول سنگ و خار نہیں
رسمِ اُلفت بدل دی ہم نے ایاز
جیت اب جیت، ہار ہار نہیں

✦✦✦

Translogic International

Translate.connect.inspire

انگریزی سے اردو کتب کا معیاری ترجمہ

ہم آپ کے خیالات کو بامعنی الفاظ میں ڈھالتے ہیں

خدمات:

ہر موضوع پر اعلیٰ معیار کے تراجم

کتاب نویسی اور مواد کی تیاری میں مکمل معاونت

اشاعت کے تمام مراحل میں پیشہ ورانہ رہنمائی

100% رازداری اور معیار کی مکمل ضمانت

اپنی تخلیق کو عالمی زبان میں متعارف کروائیں

Translogic Intl کے ساتھ!

فیروز سینٹر، غازی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

C.E.O: حسن محمود 0300-4489310

نستعلیق مطبوعات

اردو ادب کے فروغ کا معتبر نام

پاکستان کا وہ ادبی ادارہ جو اب تک مختلف موضوعات پہ

چھ سو سے زائد کتب شائع کر چکا ہے

معیار، نفاست، اور اعتماد کی پہچان!

آپ بھی اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے ہم سے رابطہ کریں۔ ہم فراہم کرتے ہیں:

کتاب کی ترتیب و تزئین

طباعت و اشاعت کے جدید تقاضے

مارکیٹنگ اور تشہیر میں پیشہ ورانہ معاونت

نستعلیق مطبوعات

فیروز سینٹر، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 0316-4195471

nastalique786@gmail.com

ادبی تقریبات

✦ پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے دولت کدے پر 26 اکتوبر 2025ء کو ہفتہ وار اتواری نشست منعقد ہوئی۔ اس نشست میں ڈاکٹر معین الدین عقیل (میزبان)، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر اقبال محسن، محمد حمزہ فاروقی، شاعر علی شاعر، مدحت محمد (پوتی شاعر علی شاعر)، بیگم شاعر علی شاعر، مجید رحمانی، شہزاد سلطانی، وقار شیرانی، مسعود کمالی، محمد عارف سومرو اور بدر منیر نے شرکت کی۔ نشست میں حاضرینِ محفل نے حافظ محمود خاں شیرانی کی کتاب مجموعہ نغز (اردو شعراء کے تذکرے)، محمد حمزہ فاروقی کی مختلف تخلیقات، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کی کتاب "ترکیہ اتا ترک سے اردوان تک" پر گفتگو کی۔

✦ بارسلونا میں مقیم معروف گلوکار قدیر احمد خان کو حکومت پاکستان کا صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی دینے کا فیصلہ۔ قلم قافلہ سپین اور پاکسلونا کلچرل ایسوسی ایشن کا قدیر خان کے لئے لئے نیک تمنائیوں کا اظہار۔ حکومتِ پاکستان نے بارسلونا سپین میں مقیم نامور گلوکار قدیر احمد خان کو فنِ موسیقی میں اعلی خدمات اور ریاستِ پاکستان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

قدیر احمد خان نے سپین اور یورپ بھر میں اپنے ملی نغموں اور اردو پنجابی گیتوں سے پاکستان کا نام روشن کیا ہے اور پاکستانی موسیقی، زبان اور ثقافت کے فروغ کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے۔ قدیر احمد خان نے بارسلونا اور یورپ کے مقامی شعراء ڈاکٹر عرفان مجید راجہ، ارشد نذیر ساحل، عدیل آسی کا کلام بھی اپنی خوبصورت آواز میں گایا ہے

معروف گلوکار قدیر احمد خان کو یہ ایوارڈ 23 مارچ 2026 کے موقع پر ایوان صدر پاکستان میں دیا جائے گا۔

بارسلونا کی ادبی و ثقافتی تنظیم قلم قافلہ سپین اور ریڈیو پاکسلونا کے ممبران نے بھی قدیر احمد خان کو اس ایوارڈ کی نامزدگی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے نیک تمنائیوں کا اظہار کیا۔

✦ گزشتہ شام خانہ فرہنگ ایران، لاہور کے زیر اہتمام فارسی زبان کے عظیم شاعر حافظ شیرازی کے یوم ولادت کی مناسبت سے ایک بہت عمدہ محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر جواز جعفری نے کی نے کی جب کہ مہمان خصوصی ڈاکٹر فوزیہ تبسم تھیں، نظامت کے فرائض آغا علی مزمل نے خوب صورتی سے ادا کیے، اس مشاعرے میں شعرائے کرام نے حافظ شیرازی کو خوب خراجِ تحسین پیش کیا آخر میں خانہ فرہنگ ایران کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر اصغر مسعودی نے مہمان شعراء کا شکریہ ادا کیا اور ہائی ٹی سے ان کی تواضع کا اہتمام کیا گیا۔

✦ دعا منتھیٰ پبلی کیشنز کے زیر اہتمام "ہم محبت کی بات کرتے ہیں" چوتھا ماہانہ مشاعرہ بمقام ہیڈ آفس دعا منتھیٰ پبلی کیشنز سیکنڈ فلور آفس نمبر 3A کوئینز روڈ/فاطمہ جناح روڈ بالمقابل جناح پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین نزد عابد مارکیٹ لاہور منعقد کیا گیا، اس شاندار محفل کی صدارت نامور سینئر شاعر جناب خالد شریف نے کی۔ نظامت ہمارے پیارے احمد علی کیف کے ذمہ رہی۔ اس محفل میں نامور شعرائے کرام کی اک کہکشاں جمع کی گئی تھی، کیسے کیسے عمدہ اشعار سننے کو ملے جس کا سرور تادیر قائم رہے گا۔ اس موقع پر جناب خالد شریف کے دستِ مبارک سے دعا منتھیٰ سٹوڈیو کا افتتاح بھی کیا گیا، بھی احباب نے ڈاکٹر دانش کو مبارکباد دی اور دعاؤں سے نوازا۔

✦ بتاریخ 17 اکتوبر، سہ پہر 4 بجے پشاور کی معروف پروفیسر مشرف مبشر کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے کی۔ اور پروفیسر مشرف مبشر مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئیں۔ عبدالوحید بسمل اور پروفیسر ملک ناصر داود مہمانانِ اعزاز تھے۔

اس سادہ اور پروقار تقریب میں مانسہرہ، ایبٹ آباد، حویلیاں اور ہری پور سے کثیر تعداد میں شعرا و ادبا نے شرکت فرما کر ایک مہمان ادیبہ کی خوب مہمان داری کی۔

یہ محفل برائٹ ہال لٹریری سوسائٹی ایبٹ آباد نے برائیٹ ہال ایجوکیشن سسٹم جناح آباد ایبٹ آباد کے سبزہ زار پر منعقد کرائی۔ جس میں پروفیسر مشرف مبشر کی کتابوں اور ان کی ادبی زندگی کے حوالے سے تفصیلی گفت گو ہوئی۔ اس محفل کی خاص بات تھی کہ اس میں حاضرین نے مہمان خصوصی سے ان کی ادبی اور سماجی زندگی کے حوالے سے سوال و جواب کا سلسلہ بڑی دیر جاری رکھا۔ جس کی وجہ سے مہمان ادیبہ کو کھل کر اپنے خیالات اور اپنی کاوشوں کے بارے میں تفصیل سے بتانے کا خوب موقع ملا۔

تقریب کے شرکا سے ملک ناصر داود اور عبدالوحید بسمل نے بھی خطاب کیا اور پروفیسر مشرف مبشر کی ادبی خدمات کو سراہا۔ یاد رہے کہ پروفیسر موصوفہ تین سفرناموں، دو افسانوی مجموعوں کے علاوہ کئی تحقیق و تنقیدی کتب کی خالق ہیں

ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے اپنے خطبہ صدارت میں پروفیسر صاحبہ کی علمی اور ادبی زندگی پر روشنی ڈالی اور شرکائے محفل کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ انھوں راجہ قدیر اقبال کی ادب دوستی اور ادبا و شعرا کی سرپرستی کو بھی سراہا۔

تقریب کے پہلے دور کا اختتام پر تکلف چائے اور ریفرشمنٹ سے ہوا۔ جبکہ دوسرے دور میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب احمد ریاض نے کی اور نظامت کے فرائض ریڈیو کی معروف کمپئر ارم مشتاق نے ادا کیے۔

شعرائے کرام میں جناب شہباز سرور، امین صادق، سمیہ ناز، سہیل صمیم، عذرا عندلیب، شجاعت علی شاہجی، پروفیسر مشرف مبشر، پروفیسر ملک ناصر داود، عبدالوحید بسمل اور صاحب صدارت احمد ریاض شامل تھے۔

مجھے شیخ ایاز کی شاعری نے بے حد متاثر کیا

ادب وہی ہے جو زندگی سنوارے

معروف شاعر، صحافی، وکیل، کہانی کار اور مترجم

انور ندیم علوی

سے مدیر ارژنگ حسن عباسی کا مکالمہ

قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے اصولوں کو اپنا کر ہی ملک اور ادب کی خدمت کی جا سکتی ہے

نواب شاہ (سندھ) سے تعلق رکھنے والے اردو اور پنجابی کے نامور شاعر، ادیب اور کالم نگار انور ندیم علوی (انور علی) کے آباؤ اجداد ہشیار پور سے ہجرت کر کے ساہیوال میں آباد ہوئے پھر کچھ عرصہ بعد ۱۹۳۵ء میں نواب شاہ میں سکونت اختیار کر لی۔ انور ندیم علوی نے ابتدائی تعلیم یہیں سندھی زبان میں حاصل کی۔ ایل ایل بی کا امتحان انہوں نے لاہور سے پاس کیا۔ ۱۹۷۵ء سے آپ پیشۂ وکالت سے وابستہ ہیں۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کی حیثیت سے مسلمہ شہرت و مقبولیت کے حامل ہیں۔ انور ندیم علوی نے جب اپنے اندر کا شاعر دریافت کیا تو سلیم شاہجہان پوری کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا۔ سلیم شاہجہان پوری، دل شاہجہان پوری اور مختار شاہجہان پوری کے شاگرد تھے۔ ان دو اہلِ سخن کی تخصیص یہ ہے کہ وہ حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے۔

وکالت کے ساتھ ساتھ انور ندیم علوی نے مشقِ سخن جاری رکھی اور ان کا اولین شعری مجموعہ ''جاگتی آنکھوں کے خواب'' ۱۹۸۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور اب تک 19 اردو اور پنجابی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ انور ندیم علوی کی خاص حوالہ یہ ہے کہ شیخ ایاز کی سندھی شاعری کا منظوم اردو ترجمہ ''تاج سجے تعزیروں کے'' اور منظوم پنجابی ترجمہ ''تھل ترہیائے نین'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

انور ندیم علوی کا اسلوب سادہ اور ابلاغ عام سے متصف ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مقصدیت کے اہتمام کے باوجود اسے بوجھل اور بیزار کن نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے مقصدیت کو بھی سامنے رکھا ہے۔ عہد حاضر سے گریز پا بھی نہیں کیا۔ یہ خوبیاں انہیں شاعروں کے ہجوم میں ایک نمایاں شناخت سے ہمکنار کرتی ہے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

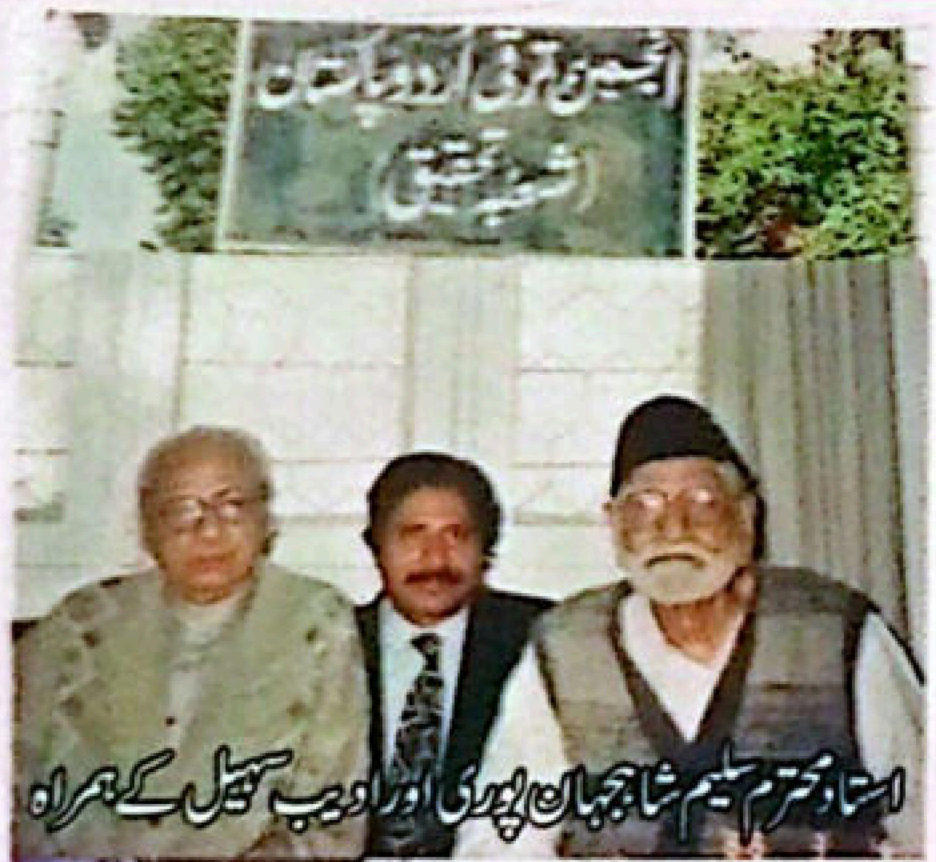

استاد محترم سلیم شاہجہان پوری اور ادیب سہیل کے ہمراہ

نذیر قیصر اور عابدہ قیصر کے ہمراہ

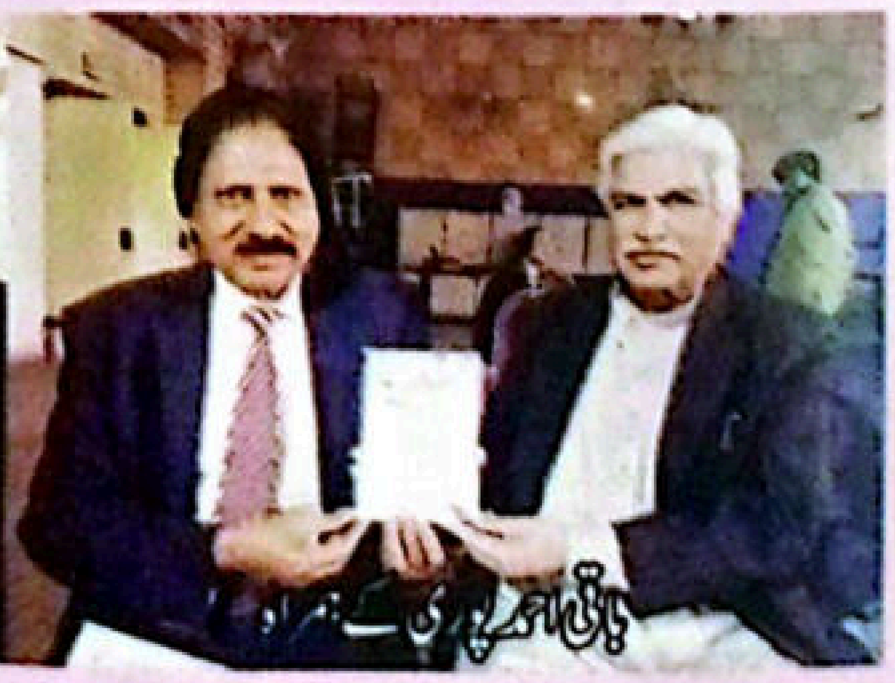
باقی احمد پوری کے ہمراہ

ڈاکٹر خورشید رضوی کے ہمراہ

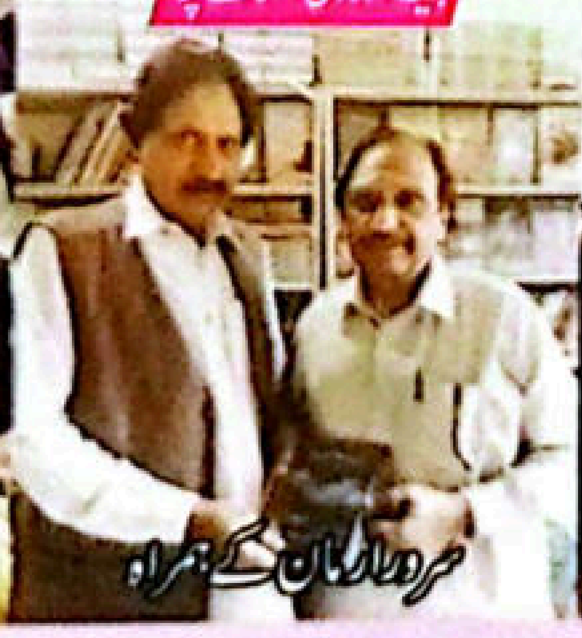
سرور ارمان کے ہمراہ

جمیل احمد عدیل اور ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے ہمراہ

پبلک آرٹ اینڈ لٹریری سوسائٹی لاہور کے زیر اہتمام

بمقام: کاسمو میٹرو پولٹن کلب باغِ جناح

عامر بن علی کی معاصر اہل قلم کے انٹرویوز پر مبنی کتاب 100 تخلیق کار کی تقریب رونمائی

میزبان **مقبول احمد چوہان** — مہمان خصوصی **کاشف منظور** — نظامت **پروفیسر ناصر بشیر**

خوشگوار ماحول میں سٹیج کا منظر

حاضرین کا انہماک دیدنی تھا

حنیف صوفی

ڈاکٹر فضیلت بانو

ناصر بشیر

عامر بن علی

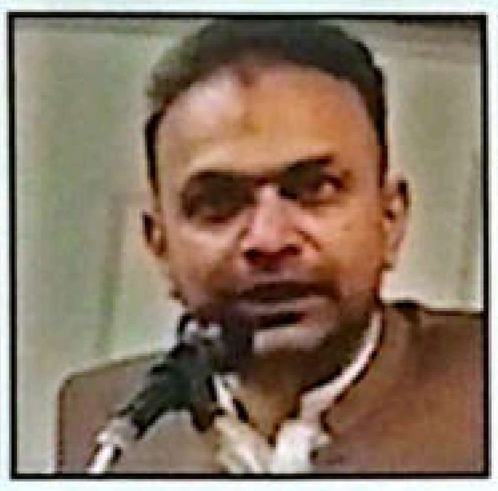

کاشف منظور

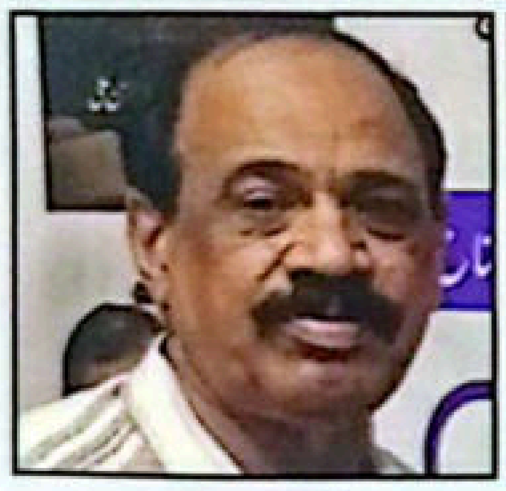

مقبول احمد چوہان

سید فرخ رضا ترمذی

حبیب پاشا (ہامون جادوگر)

فاطمہ غوری

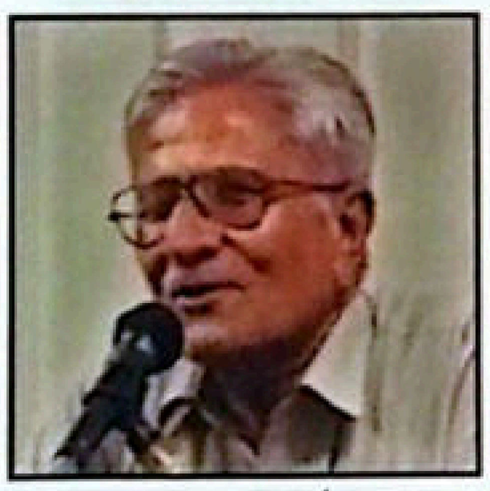

سلیم اختر ملک

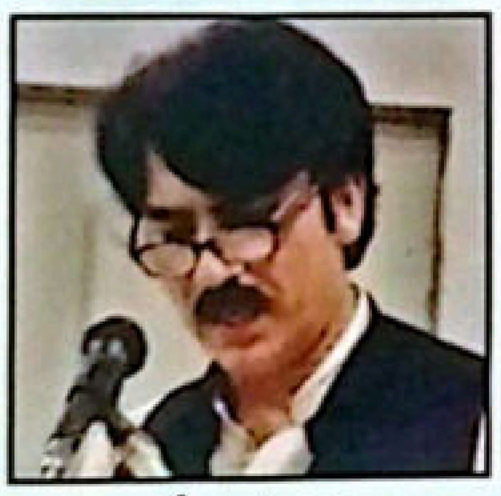

سہیل ثانی

ڈاکٹر مسعود اختر

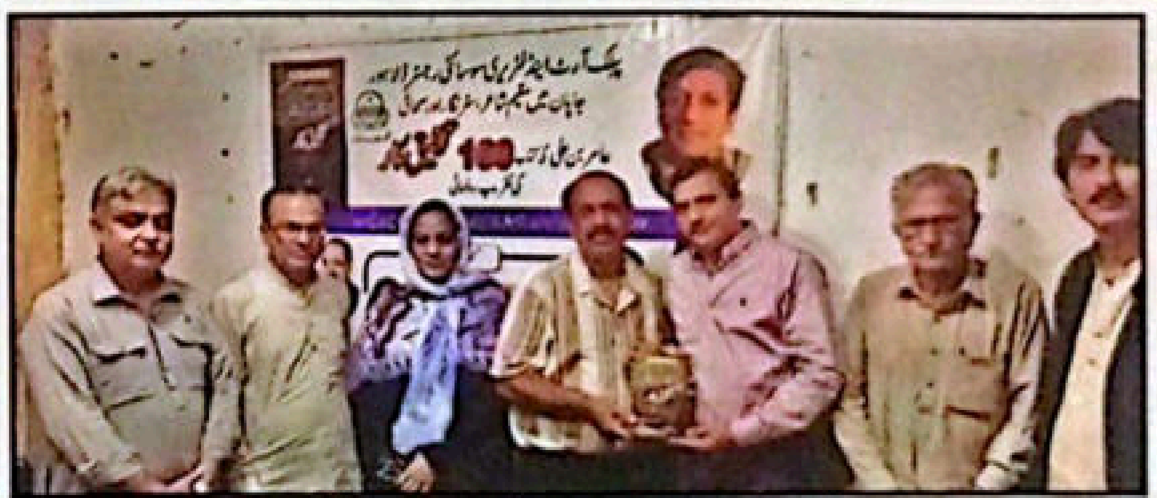

صاحب کتاب تقریب کے میزبان کو کتاب پیش کرتے ہوئے

کاشف منظور ڈائریکٹر جنرل لائبریریز پنجاب نے عامر بن علی کو قائد اعظم لائبریری کا دورہ کروایا اور تحائف پیش کیے۔

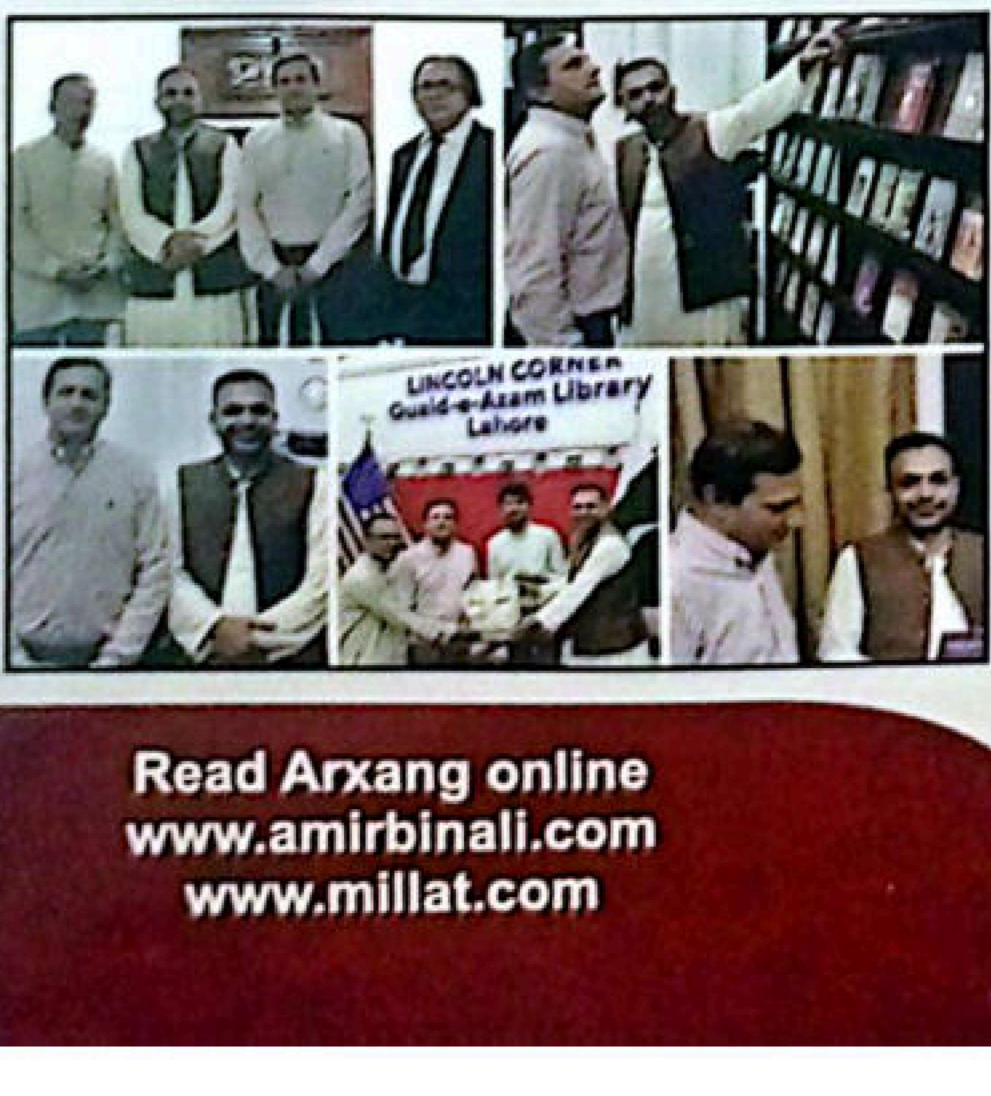

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com